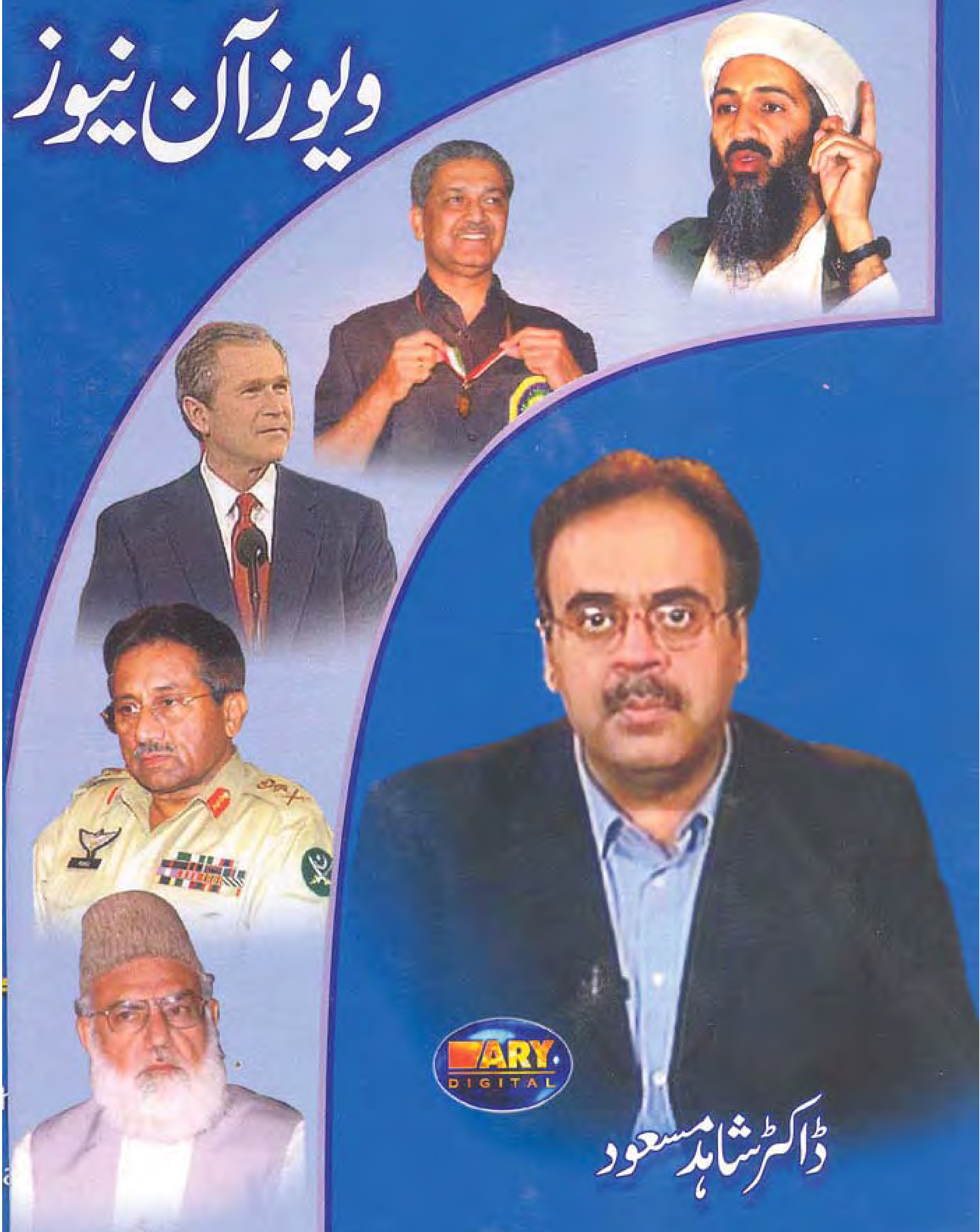
ARY DIGITAL کے مقبولِ عام پروگرام پر مبنی

views on NEWS

ویوز آن نیوز



ڈاکٹر شاہد مسعود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ویوز آن نیوز

Views on News

Views on News

ویوز آن نیوز

ڈاکٹر شاہد مسعود

Compiled & Edited by

خالد شریف

ماورا

باذوق لوگوں کے لیے
ہماری کتابیں
خوبصورت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

ضابطہ

بار سوئم	:	۲۰۰۶ء
کمپوزنگ	:	ماورا کمپوزنگ
ناشر	:	ماورا پبلشرز' لاہور
طابع	:	شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت	:	-/250 روپے

ISBN-969-554-008-2

ترتیب

عرضِ ناشر

''ویوز آن نیوز'' ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب کا اے آر وائی چینل پر چلنے والا مقبولِ عام پروگرام ہے جسے ہر طبقہء فکر کے لوگ ذوق وشوق سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا لہجہ دل نشین ہے' معلومات انتہائی جامع اور ان کی تحقیق حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس پروگرام میں وہ دنیا بھر کے دانشوروں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں چنانچہ ہر شب ان کے پروگرام کا اختتام کسی مہمانِ عزیز سے فکر انگیز گفتگو پر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے کام اور مقام کے بارے میں لکھنا میرا منصب نہیں اور اس بارے میں پاکستان اور دنیا بھر کے صاحبِ دل دانشور دو آراء نہیں رکھتے۔ سچ ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں وہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو چکے ہیں اور میں خود انہی بہت سے لوگوں میں سے ایک ہوں۔

کچھ عرصہ پہلے دبئی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ویوز آن نیوز کے منتخب پروگرامز کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ان کے پروگرام ''اینڈ آف ٹائم'' کو بھی' جو کائنات کے ممکنہ انجام کے بارے میں ہے اس نظر سے دیکھوں۔ چنانچہ میں نے اس پروگرام کو خود Transcribe کیا اور

ڈاکٹر صاحب نے اس کا مسودہ دیکھنے کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دی۔ انہی کی خواہش اور ہدایت کے مطابق روزنامہ ''جناح'' کے گروپ ایڈیٹر جناب عبدالودود قریشی سے رابطہ کیا گیا جنہوں نے کمال محبت سے روزنامہ جناح سے ان پروگرامز پر مبنی مواد کی فراہمی میں فراخدلانہ تعاون کیا۔ اس کتاب میں شامل پروگراموں کے انتخاب کو بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزارا گیا تب کہیں یہ مرحلۂ طباعت تک پہنچے۔

یہاں میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قبل ازیں شائع ہونے والی کتاب اینڈ آف ٹائم' موجودہ کتاب اور اس کے بعد آنے والی کتب کے جملہ دائمی حقوق بحق ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب محفوظ ہیں۔ البتہ ان کے حقوقِ اشاعت اُن کی اجازت سے ماورا پبلشرز کے پاس محفوظ ہیں اور اس ضمن میں کاپی رائٹ ایکٹ کی دفعات واضح ہیں۔

خالد شریف

11 نومبر 2004ء

ایک کرشماتی شخصیت

ان دنوں مشرق و مغرب میں قحط الرجال کی سی کیفیت ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اس دورِ زوال میں ہمارے درمیان ڈاکٹر شاہد مسعود کی صورت میں ایک ایسے دانشور کا ظہور ہوا ہے جس کی ژرف نگاہی، مطالعہ، تجزیہ اور انداز بیان اپنوں اور غیروں کو مبہوت کیئے ہوئے ہے۔ بلاشبہ وہ ایک کرشماتی شخصیت کے حامل انسان ہیں۔

عطاالحق قاسمی

4 نومبر 2004ء

اے محسنِ پاکستان تجھے سلام!

قوم تجھ سے معافی کی طلب گار ہے

صدر مملکت نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے حوالے سے میڈیا کے نمائندوں سے تفصیلی گفتگو کی ہے اور بہت سے ابہام اور ذہنوں میں جنم لیتے سوالات کا جواب دیا ہے۔

صدر نے تمام سلسلے کی وضاحت فرماتے ہوئے نہ صرف میڈیا کے مجموعی کردار پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے اور یہ بھی واضح فرمایا ہے کہ کوئی بھی سابق حکومت یا آرمی چیف نہیں بلکہ ڈاکٹر قدیر خان ذاتی طور پر ایٹمی پھیلاؤ کے تمام سلسلوں میں ملوث رہے ہیں۔

اس سے پہلے معافی نامہ ٹی وی پر پڑھے جانے کے بعد نیشنل کمانڈ اتھارٹی کے اکابرین سے ہوتا ہوا وفاقی کابینہ کے معززین سے قبولیت کے بعد صدر مملکت نے بھی منظور فرمالیا۔ ڈاکٹر قدیر خان اب ایسے پاکستانی شہری ہیں جو اپنی باقی زندگی ایک ایسے شخص کے طور پر گزارے جانے کے مستحق ٹھہرائے گئے ہیں جسے اپنے گناہ تسلیم کئے جانے کے بعد کسی چوک یا شاہراہ پر نشان عبرت بنادینے کے بجائے اس لئے ترس کھا کر معاف کردیا گیا ہے کہ چھوڑو جانے دو بے چارے نے ایٹم بم بنا کر پاکستان کو دیا ہے۔ ڈاکٹر قدیر صاحب کو یہ اعزاز بھی مبارک ہو۔ معافی مل جانے کے بعد بتایا جارہا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کی گرانقدر خدمات کے پیش نظر انہیں تمام عمر ایک حفاظتی حصار میں رکھا جائے گا اور وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کر پائیں گے۔ یہ بھی فرمایا جارہا ہے کہ ان کے پاس اب کوئی کام نہیں ہوگا۔ انہیں

سکون سے زندگی گزارنے کا کہا جائے گا اور گھر بیٹھے تنخواہ وغیرہ دی جاتی رہے گی۔ میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر صاحب اس بے چینی کا کیا کریں گے جو پچھلے ستائیس سال سے مسلسل اٹھارہ، اٹھارہ گھنٹے محنت سے کام کرنے کے بعد ان کی ہڈیوں کا حصہ بن چکی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر اب بیرون ملک بھی سفر نہیں کر پائیں گے۔ باوجود اس حقیقت کے دنیا بھر کے کئی تحقیقاتی ادارے یونیورسٹیز اور دنیا کے وہ ممالک جہاں کام کرنے والے انسانوں کی قدر ہوتی ہے اس شخص کو اپنے ہاں بلانا چاہیں گے جس نے ایک ایسے ملک کو ایٹمی قوت بنا دیا جو سائیکل کی چین اور بیرنگ بھی اس وقت باہر سے منگواتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ڈاکٹر آف سائنس کی تین ڈگریز اور دو نشان امتیاز اپنے سینے پہ سجانے کے بعد پاکستان کو ایٹم بم دینے کے علاوہ برسرِ عام ٹی وی پر معافی مانگنے والے پہلے پاکستانی بھی ٹھہرے۔

ایک ایسی قوم سے جہاں کبھی کسی نے اپنے گناہوں اور غلطیوں کو تسلیم نہیں کیا ہمیشہ ان پر فخر کیا ہے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ان گناہوں کی بھی معافی مانگی ہے جو شاید ان سے کبھی سرزد بھی نہیں ہوئے۔ ان کے علاوہ کیونکہ اس پورے قصے میں کوئی بھی حکومت یا کوئی دوسرا افرد یا عہدیدار یا ادارہ شریک نہیں تھا اس لئے کوئی اور اس عزت کا مستحق نہیں ٹھہرے گا۔ یہ تمغہ ہم نے صرف اپنے 66 سالہ سائنس دان کے سینے پر ہی سجانا تھا۔ کوئی معافی نہیں مانگتا اور کسی نے کبھی معافی نہیں مانگی۔ پاکستان کی 56 سالہ تاریخ دیکھ لیں معافیوں کے حوالے سے۔ جن کی انگلیوں میں ایک ایک لاکھ ڈالر کی انگوٹھیاں جن کے گلے میں ایک ایک لاکھ اسٹرلنگ پاؤنڈز کے نیکلس چمکتے رہے انہوں نے بھی کبھی قوم سے معافی نہیں مانگی۔ جن کے لانز میں دو دو لاکھ کے کتے اور اصطبلوں میں ساٹھ، ساٹھ لاکھ کے ارجنٹائی گھوڑے رہے جو دس دس لاکھ کے اونٹ اور چالیس چالیس ہزار کی بھیڑیں پالتے رہے انہوں نے بھی کبھی قوم سے معافی نہیں مانگی، وہ جو کئی بینک خالی کر گئے اور ان جاگیروں پر عارضی قابض ہیں

جن کی پیمائش کو بھی کئی کئی ملازمین درکار ہیں اور جن کے مرید ان پر ہر سال کروڑوں کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور جن کے ہوٹلوں کے بل کئی کروڑوں سے تجاوز کر جاتے ہیں انہوں نے بھی کبھی اس قوم سے معافی نہیں مانگی اور وہ جن کی زمینوں پر لاکھوں مزارع جانوروں جیسی زندگی گزارتے ہیں اور جن کے بچے دنیا کی مہنگی ترین درسگاہوں میں زیر تعلیم ہیں اور جو ہر سال طوائفوں پر کروڑوں روپیہ لٹا دیتے ہیں اور جن کے گھر پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہیں اور جو ہر سال گرمیاں یورپ میں گزارتے ہیں اور جو بسنت پر دس دس ہزار روپے کی پتنگیں اُڑا کے لاکھوں روپے کا روٹی ٹکرا اپنے مہمانوں کو کھلا کر اپنے اہلخانہ کے سامنے مجروں میں نشے میں دھت بدمست ہو کر ناچتے ہیں انہوں نے بھی کبھی معافی نہیں مانگی جن کی اگلی دس پشتیں دودھ سے نہا سکتی ہیں سونے کے نوالے کھا سکتی ہیں اور چاندی کے بستروں پر آرام فرما سکتی ہیں جن کے الیکشن کمیشن میں جمع کروائے گئے گوشواروں میں درج جائیدادوں سے زیادہ ان کے ملازمین کی ملکیتیں ہیں انہوں نے بھی کبھی قوم سے معافی نہیں مانگی۔

1985ء سے لے کر 1999ء تک اس ملک کے بینکوں اور مالیاتی اداروں نے تیس ارب روپے کے قرضے معاف کیے یعنی 166 ملین روپیہ ماہانہ۔ یہ سیاسی حکومتوں کے دور تھے کسی نے قوم سے معافی نہیں مانگی۔

اس کے بعد پچھلے چار سالوں میں پچیس ارب روپے کے قرضے معاف ہوئے یعنی 520 ملین روپے ماہانہ یا سترہ ملین روپے روزانہ۔ کسی نے قوم سے معافی نہیں مانگی یا 1994ء سے لے کر 2002ء تک سوشل ایکشن پروگرام کے نام پر چھ سو ارب روپیہ کھایا گیا اور جہاں ٹرانسپیرنسی کی رپورٹ ہمیں یہ کہتی ہے کہ تعلیم کے شعبے میں 92 فیصد، صحت کے شعبے میں 95 فیصد اور عدالتوں میں 98 فیصد کرپشن ہے کوئی متعلقہ وزیر یا جج ٹی وی پر

آ کے قوم سے معافی نہیں مانگتا۔ ہر دوسرے مہینے ریلوے پھاٹکوں پر غیر ذمہ داری سے بے شمار افراد مارے جاتے ہیں لیکن کوئی وزیر ریلوے معافی نہیں مانگتا۔ مساجد امام بارگاہوں شاہراہوں پر دہشت گرد حملے کر کے بے گناہوں کو خون میں نہلا دیں تو وزیر داخلہ فرماتے ہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد کیا صدر بش نے معافی مانگی تھی یا استعفیٰ دیا تھا۔

کبھی تو افغانستان میں امریکہ کی لڑی جانے والی لڑائی جہاد بتائی جاتی ہے اور کبھی طالبان کو کئی سال تک مکمل تعاون کرنے کے بعد خون میں نہانے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ غلط پالیسی کے نتیجے میں ہزار ہا بے گناہ جانیں گنوا بیٹھے ہیں لیکن کوئی پالیسی میکر معافی نہیں مانگتا۔ کشمیر میں جہاد کیلئے ملک بھر کے نوجوانوں کو منبر و محراب کے نام پر بلایا جاتا ہے وہ جاتے ہیں لڑتے ہیں شہید ہوتے ہیں۔ گھاٹیوں میں پہاڑوں میں گولیوں کا نشانہ بن کر دفن ہو جاتے ہیں اور پھر یہی جہاد دہشت گردی قرار پاتا ہے تو کوئی ان شہیدوں سے یا دہشت گردوں سے اور ان کے اہلخانہ یا قوم سے معافی نہیں مانگتا۔ ماضی کا کوئی پالیسی میکر، کوئی بیان داغتا سیاستدان، کوئی جذبات میں آگ لگاتا خطیب کوئی مقرر ٹی وی پر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا نظر نہیں آتا اور معافی نہیں مانگتا۔ وہ بھی اسی ملک کا حکمران رہا جس کے غیر ملکی دورے کے دوران جہاز محض اس لئے دو گھنٹے فضا میں چکر لگاتا رہا کہ صدر محترم کا نشہ اتر جائے اور جب وہ دشمن پر حملے کا حکم دینے نکلے تو دو جوانوں نے انہیں دائیں بائیں سے اٹھا رکھا تھا۔ جو ایوانِ صدر میں مستی میں جھوم کر قومی ترانہ گاتے رہے اور جنہوں نے اپنی رانی کو جنرل کا رینک بھی عطا کیا۔ ملک ٹوٹ گیا اور ان کے انتقال کے بعد انہیں 21 توپوں کی سلامی کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا انہوں نے ٹی وی پر آ کر قوم سے کسی غلطی کی معافی نہیں مانگی۔ جس نے سقوطِ ڈھاکہ کی ذلت آمیز دستاویز پہ دستخط کرنے کے بعد بھارتی جنرل ناگرہ کو گندے لطیفے سناتے ہوئے کہا کہ میں اپنی قوم کا ہیرو ہوں اس نے کبھی اپنی زندگی میں قوم سے معافی نہیں

مانگی، جنہوں نے پرائیویٹ سیکورٹی فورسز بنا کر مخالفین کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور انہیں ایوانوں سے اٹھوا کر پھینکوا دیا انہوں نے بھی کبھی قوم سے معافی نہیں مانگی اور جنہوں نے اسلام کے نام پر اس قوم کو کلاشنکوف اور ہیروئن کے تحفے دیئے عدالتوں کے ججوں سے پھانسی کے فیصلے کروائے اور آئین کو محض ایک کتاب قرار دیا انہوں نے بھی کبھی معافی نہیں مانگی۔

اسی ملک میں ایک ایسی ہندو عورت بھی خاتونِ اول بنیں کثرت شراب نوشی سے جن کا جگر جواب دے گیا تو وہ شرابیوں کو جمع کر کے ان کے سامنے سامان مے نوشی سجاتیں اور پھر انہیں شراب پیتا دیکھ کر خوش ہوتیں۔ وہ سیکرٹری دفاع بھی اس ملک کا صدر بنا جس کی بیوی ہر لمحے اس کے پیچھے پھرتی کہ کسی کمزور لمحے کوئی دوسری عورت فرسٹ لیڈی نہ بن جائے۔ وہ شیر بھی اس صوبے پر حکومت کرتا رہا جس کے قبضے سے گورنمنٹ کالج لاہور کی اغوا شدہ طالبہ درآمد ہوئی۔ وہ بھی آج ہمارے محترم رہنما ٹھہرے جن کی تصویر آخری لمحے تک ٹی وی کی ایک اداکارہ کے بیڈروم میں لگی رہی اور وہ بھی ہمارے ایوانوں کے نگران رہے جنہوں نے اپنے دوستوں کی محفل میں بڑے دعوے سے کہا تھا تم شرط لگا لو وہ اب زندگی بھر کبھی نہیں گائے گی۔ وہ بھی ایک صوبے کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے بچوں بچیوں کے مستقبل کا رکھوالا ہے جس کے بارے میں بوڑھے سیاست دان نے پوری قوم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یہی میری بیٹی سے اجتماعی زیادتی کا مرتکب رہا اور وہ وزیر بھی اپنی غلطی بتا گیا جو چوری کی گاڑی خریدنے علاقہ غیر گیا پھر سمگلروں سے ٹال مٹول کرتا ہوا ان کی قید سے بقیہ رقم کی ادائیگی تک رہا نہ ہوسکا اور وہ جلاوطن رہنما جو سندھ کا وزیر اعلیٰ مقرر ہوا وہ کھلے عام کہتا رہا کہ میں پیتا ہوں اور ڈٹ کے پیتا ہوں اس ملک کی سیاسی تاریخ لکھتے وقت سرکاری ہوٹلز کے سویپرز کے انٹرویوز بھی شامل کیئے جائیں جو کمروں سے خون آلود چوڑیوں کے ٹکڑے جمع کرتے اور بوتلیں چھپاتے رہے لیکن کسی صدر وزیر اعظم، وزیر، مشیر، رکنِ اسمبلی بیورو کریٹ یا جج نے آج

تک قوم سے معافی نہیں مانگی۔

وہ جو ہر سال ساٹھ کروڑ کے محصولات بچاتے رہے، جو پچیس کروڑ روپے کی ایکسائز ڈیوٹی، چوبیس کروڑ روپے کا نہری پانی، پندرہ کروڑ روپے کی لکڑی، بائیس کروڑ روپے کی بجلی اور گیس چراتے رہے ان کو ٹی وی پر قوم کے سامنے معافی مانگنے نہیں لایا گیا۔ جو سرکاری دفاتر سے ہر سال ڈیڑھ کروڑ کی سٹیشنری چراتے ہیں، پانچ کروڑ کا سیمنٹ، سریا اور لوہا پار کر جاتے ہیں، آٹھ کروڑ کی تاریں، بجلی کے کھمبے اور ٹرانسفارمر غائب کر جاتے ہیں، گیارہ کروڑ کی ادویات ہسپتالوں کے انسٹرومنٹس اور مریضوں کی خوراک کھا جاتے ہیں، بارہ کروڑ کی سڑکیں اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں اور اٹھارہ کروڑ کی گلیاں نالیاں اور پلیا پی جاتے ہیں، جو کہ پانچ لاکھ گیلن سالانہ سرکاری پٹرول بسوں اور ویگنوں کے اڈوں پر بیچتے ہیں اس میں سے کسی کو دبوچ کر عوام کے سامنے معافی مانگنے کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ جہاں کے شاہ، لغاری، مزاری، پیر، جتوئی، کھوسے، مخدوم، ملک، ٹوانے، خٹک، آفریدی، نواب، باچے، میر ہر سال قوم کا چھ ارب روپیہ کتا دوڑوں، ریچھ کی لڑائیوں، بٹیر بازیوں اور عیاشیوں میں خرچ کرتے ہیں۔ ہر سال جو سات ارب کی گاڑیاں خریدیں اور ڈیڑھ کروڑ روپے کا تمبا کو پھونک دیں، جو اس ملک میں نہریں نہ کھدنے دیں، سکول نہ بننے دیں، بجلی نہ لگنے دیں، ٹریکٹر نہ چلنے دیں، زرعی ٹیکس نافذ نہ ہونے دیں، ووٹ نہ ڈلنے دیں، مردم شماری نہ ہونے دیں، گاؤں میں ریڈیو بند کرا دیں، اخبار جلا دیں، گندم نہ بونے دیں، سوال نہ کرنے دیں، جو انسانوں کو اپنے ڈیروں پر کتوں کی طرح باندھ کے رکھیں، جو زمین میں گاڑ دیں انسانوں کو، جو انسانوں کو اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور کر دیں، جو ہر سال بارہ ارب روپے کی غیر ملکی شراب پی جائیں اور جو تیس ارب روپیہ جوئے میں ہار جائیں، جو آج بھی ملک میں منشیات کے 65ہزار اڈوں کے مالک ہوں اور ہر سال 80'70 کروڑ روپیہ جگا ٹیکس وصول کریں،

تھانے خریدیں، چوکیاں بیچیں ان کو ضلعی صوبائی ،قومی ایوانوں میں بیٹھنے کے بجائے گردن سے دبوچ کے عوام سے معافی مانگنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

جو خود نیب کی ڈی بریفنگ کو بھگتا کے کابینہ کے اجلاسوں میں بیٹھ کر ڈی بریفنگ سے گزرتے سائنسدانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں فخر محسوس کریں لیکن معافی نہ مانگیں۔

جی ناظرین قوموں کا سرمایہ کھیت ،فیکٹریاں ،گاڑیاں ،ادارے ،محلات اور ایوان نہیں ہوتے لوگ ہوتے ہیں اپنے ملک سے محبت کرنے والے ،اسے تعمیر کرنے والے ہنر مند لوگ اور جو قوم اپنے محسنوں کی تضحیک کیا کرتی ہے اس سے بڑی قلاش قوم کوئی نہیں ہوتی خواہ اس کے سارے پہاڑ سونا بن جائیں سارے دریاؤں اور سارے بیراجوں سے تیل بہنے لگے سارے درختوں پر اشرفیاں اُگنے لگیں اور آسمان سے ڈالروں کا مینہ برسنے لگے وہ قوم قلاش کہلاتی ہے۔

کسی نے خبر دی کہ معافی مل جانے کے بعد ڈاکٹر قدیر خان پھوٹ پھوٹ کر روئے بالکل ان ماؤں کی طرح جو اپنے جوان بچوں کی مرگ پر روتی ہیں اس چڑیا کی طرح جو اپنا بچہ گھونسلے سے گرنے پر رویہ ظاہر کرتی ہے۔

میں خود ڈاکٹر قدیر خان سے ملنا نہیں چاہتا ان سے بات نہیں کرنا چاہتا کہ اس کے بعد میرے ذہنی خلجان میں مزید اضافہ ہو جائے گا بس یہ پیغام کسی ذریعے سے پہنچانا چاہتا ہوں کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک پاکستانی کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان آپ سے معافی کا طلب گار ہوں۔

آپ قوم کا نمائندہ سمجھ کے معاف کر دیجئے گا مجھے بھی اور اس پوری قوم کو بھی ہم آپ سے شرمندہ ہیں ،شرمسار ہیں۔

6 جنوری 2004ء

70 کلفٹن اور غنویٰ بھٹو

آج میں پاکستان کے ایک ایسے مکان ایسی رہائش گاہ میں بیٹھا ہوں جس کا ملکی تاریخ میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ جس کا نام 70 کلفٹن ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں سے انہوں نے ایوب خان کے خلاف جدوجہد کا اعلان و آغاز کیا اور پاکستان پیپلز پارٹی بنائی پھر اپنے دور اقتدار میں یہ وزیراعظم ہاؤس کا کام بھی کرتا رہا اور اس کے بعد جب وہ اپنے اقتدار سے گئے تو پھر بھی اس رہائش گاہ کا ایک اہم کردار رہا۔ پھر ان کے جیل سے رہا ہونے کے بعد کچھ عرصے کیلئے پھر ان کی پھانسی تک جب جب وہ کراچی آئے وہ اسی جگہ پر رہے۔ اس کے بعد بیگم نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو اور پھر مرتضیٰ بھٹو بھی اسی رہائش گاہ میں رہے۔ کچھ المناک داستانیں اور کہانیاں بھی اس رہائش گاہ سے وابسطہ ہیں اس رہائش گاہ کے مکین کبھی بہت زیادہ خوش نہیں رہے۔

70 کلفٹن کی موجودہ مکین جو کہ آج میرے ساتھ موجود ہیں جو کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ اور پاکستان پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کی سربراہ غنویٰ بھٹو صاحبہ ہیں۔

☆☆ غنویٰ بھٹو صاحبہ السلام علیکم

☆☆ وعلیکم السلام ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب۔

☆☆ محترمہ جہاں آپ آٹھ نو برس سے رہ رہی ہیں یہ ایک زمانے میں وزیر اعظم ہاؤس بھی رہا ہے آپ ذوالفقار علی بھٹو سے نہیں ملیں لیکن اس جگہ کی ایک سیاسی تاریخ ہے۔آپ اس حوالے سے کیسے دیکھتی ہیں کیا وہی روایات برقرار ہیں جو ایک دور میں تھیں کیا آپ ان روایات کو قائم رکھ سکی ہیں یا یہ جگہ تاریخ سے غائب ہوگئی ہے؟

☆☆ میں 70 کلفٹن میں گیارہ سال سے رہائش پذیر ہوں یعنی جب سے میں پاکستان میں ہوں۔ میں تقریباً آٹھ سال سے اکیلی ہوں اگلے مہینے مرتضیٰ کی آٹھویں برسی ہے۔ میں شہید ذوالفقار علی بھٹو سے تو نہیں ملی لیکن عرب ممالک میں آپ کو پتا ہے کہ ان سے لوگ کتنا پیار اور محبت کرتے تھے اور عزت کرتے تھے تو اس لئے شہید ذوالفقار علی بھٹو میرے لئے کوئی ایسی شخصیت نہیں تھے جن کو میں نہ جانتی ہوں میرے دل میں ان کیلئے بہت عزت واحترام موجود ہے اور رہے گا اور پورے عرب ممالک میں ان کی ابھی بھی عزت کی جاتی ہے۔

☆☆ جب آپ کی ملاقات مرتضیٰ بھٹو سے ہوئی تھی تو اس وقت میر مرتضیٰ بھٹو پاکستان کو انتہائی مطلوب تھے اور اُس وقت کی حکومت نے میر مرتضے بھٹو کو دہشت گرد قرار دے دیا تھا۔تو جب آپ ان سے ملیں تو کیا آپ ڈری ہوئیں تھیں کہ آپ ایک دہشت گرد سے مل رہی ہیں جو کہ پاکستان کو انتہائی مطلوب ہے۔

☆☆ میں نہیں مانتی کہ وہ دہشت گرد تھے اور ہم لوگ جانتے تھے کہ ضیاء الحق کون تھا اور لوگ اس سے نفرت کرتے تھے تمام عرب ممالک میں اور خاص طور پر شام اور لبنان میں ضیاء الحق سے نفرت کی جاتی تھی مرتضے بھٹو ہمارے لئے دہشت گرد نہیں تھا بلکہ وہ ایک بہادر انسان تھا اور بہادر آدمی کا بیٹا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ ان کی جان خطرے میں

ہے اور یہ تمام باتیں مجھے آہستہ آہستہ پتہ چلیں جب میں اور فاطمہ شادی کے بعد 1989ء پاکستان واپس آئیں میں اس وقت بہت پریشان ہوئی جب ہم مرتضٰی کی قبر پر دعا مانگنے گئے تھے پہلی بار میری ساس نے مجھے رہنے کیلئے اپنا ذاتی کمرہ دیا اور مجھے یاد ہے کہ اس رات مجھے نیند نہیں آئی ساری رات میں پریشان رہی۔

☆☆ آپ کی شادی کو نصرت بھٹو نے قبول کیا تھا اور کیا آپ کو پتا تھا کہ مرتضٰی بھٹو کی پہلے بھی شادی ہو چکی ہے اور ان کی ایک بیٹی بھی ہے؟۔

☆☆ جی مجھے سب معلوم تھا کہ مرتضٰی بھٹو کی پہلے بھی شادی ہوئی تھی اور اس میں سے ایک بیٹی بھی ہے لیکن میں نے ہر دم کوشش کی کہ میں دونوں کو زیادہ سے زیادہ پیار اور سکون دے سکوں اور میں نے کر کے دکھایا وہ دونوں مجھ سے بہت خوش تھے۔

☆☆ محترمہ بے نظیر بھٹو نے آپ کو کس طرح خوش آمدید کہا اور ان کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا جبکہ وہ اقتدار میں تھیں؟۔

☆☆ وہ بہت اچھے طریقے سے میرے ساتھ پیش آئیں۔ میرے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا اور وہ میری اور مرتضٰی بھٹو کی شادی سے بہت خوش تھیں ہماری شادی شام میں سرانجام پائی تھی بہت چھوٹا سا پروگرام تھا کوئی خاص ہلہ گلہ نہیں کیا تھا کیونکہ میرے ملک لبنان میں جنگ ہو رہی تھی اور ادھر پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں تھے اس لئے ہم نے بڑی سادگی سے شادی کی میری ساس صاحبہ اور میرے والدین اور کچھ دوست وغیرہ بھی موجود تھے میری ملاقات بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو سے شادی سے پہلے ہوئی تھی دونوں کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔

☆☆ بے نظیر بھٹو اور آپ میں اختلاف کی کیا وجہ تھی۔

☆☆ میرا اختلاف تب شروع ہوا جب میں مرتضٰی بھٹو کی انتخابی مہم میں

شریک ہوئی کیونکہ مرتضیٰ اس وقت شام میں تھے۔ میں ان لوگوں کی مخالفت کرتی تھی جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے نام پر الیکشن لڑتے تھے۔ جو مرتضیٰ کے خلاف تھے اس کے علاوہ میری مہم کسی کے خلاف نہیں تھی۔ جب مرتضیٰ کو جیل میں بند کر دیا گیا تب حالات زیادہ بگڑ گئے۔ باقی میری ساس نے بہت کوشش کی کہ دونوں بہن بھائی کے آپس کے تعلقات بہتر ہو جائیں مگر یہ کام ان کیلئے بہت مشکل تھا لیکن پھر بھی نصرت بھٹو صاحبہ نے دونوں طرف دھیان دیا اور کوشش کی کہ دونوں کے تعلقات آپس میں ٹھیک ہو جائیں۔

☆☆ مرتضیٰ بھٹو کے دائیں بائیں جو لوگ تھے یا ان کے دوست وغیرہ ان تمام کے بارے میں یہ کہا گیا کہ تمام الذوالفقار تنظیم کے اندر رہے ہیں اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث رہے ہیں کیا یہ بات درست ہے؟۔

☆☆ میں اس بات کو بالکل نہیں مانتی کہ مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ جو لوگ تھے وہ دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث رہے ہیں۔ یہ سب لوگوں کی باتیں ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ جو لوگ تھے وہ غلط کاموں میں ملوث تھے تو کہنے والے اس وقت کیا کر رہے تھے۔ کیا وہ ان کاموں میں ملوث نہیں تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنے گریبان میں جھانکیں نیچے سے لے کر اوپر تک سب ان کارروائیوں میں ملوث رہے ہیں۔ باقی مرتضیٰ پر الزام لگانے والے تو بہت تھے۔ کئی قسم کے الزامات لگائے گئے۔ یہ بھی الزام تھا کہ انہوں نے طیارہ اغواء کیا تھا یہ سب ایجنسیوں کا کیا دھرا تھا اس میں الذوالفقار کا کوئی ہاتھ نہیں تھا جو بھی الزامات لگائے گئے سب جھوٹ پر مبنی تھے۔ ان کارروائیوں سے مرتضیٰ کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ان کی پوزیشن کو تمام دنیا میں خراب کیا گیا۔ انہیں دہشت گرد قرار دیا گیا۔ پھر انہیں ایجنسیوں کے ذریعے قتل کروا دیا۔ گیا اس طرح ان الزامات کی وجہ سے ان کی پوری زندگی خراب کر دی گئی۔ ان سے جینے کا حق چھین لیا گیا۔ ان کی سیاسی ساکھ خراب کی گئی۔ اگر

انہوں نے طیارہ اغواء کیا تھا تو ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جو لوگ ضیاء الحق کی قید میں ہیں انہیں رہا کیا جائے یہ گورنمنٹ کا تیار کردہ ڈرامہ تھا اس میں کوئی حقیقت نام کی چیز نہیں تھی۔ باقی زرداری اور مرتضیٰ بھٹو کے تعلقات آپس میں اچھے نہیں تھے کیونکہ آصف زرداری گورنمنٹ میں تھے اور پیسے بنانے کے چکر میں آئے ہوئے تھے۔ باقی پرویز مشرف کی گورنمنٹ بہت اچھی چل رہی ہے لیکن جو حالات پیدا ہو رہے ہیں وہ میری سمجھ سے باہر ہیں یعنی خودکش حملے ہو رہے ہیں۔ اعلیٰ شخصیات پر اس چیز کو کنٹرول کرنا چاہئے یہ ہمارے ملک کیلئے بدنامی کا باعث ہیں۔

6اگست2004ء

صدر جنرل محمد ضیاء الحق (مرحوم) اور C-130

السلام علیکم! آج سترہ اگست ہے آج سے سولہ سال پہلے یعنی سترہ اگست 1988ء کی سہ پہر تین بجکر 46 منٹ پر امریکی ساخت کے ایک سی 130 پی ٹرانسپورٹ طیارے نے جس کا نام پاک ون تھا بہاولپور کے نزدیک ایک فوجی ہوائی اڈے سے پرواز کی۔ طیارے کی منزل اسلام آباد تھی۔ سی 130 طیارہ پہلی بار 1954ء میں بنایا گیا تھا اس حادثے تک دنیا میں 1900 ایسے طیارے فروخت ہو چکے تھے اور انہیں 62 ممالک استعمال کر رہے تھے۔ سی 130 دنیا کا محفوظ ترین طیارہ کہلاتا ہے کیونکہ انجن بند ہو جانے کے باوجود یہ جہاز لینڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جہاز کے ایئر کنڈیشن وی آئی پی کیپسول میں چار مسافر سوار تھے۔ اگلی دو نشستوں میں سے ایک پر صدر مملکت اور چیف آف آرمی سٹاف صدر جنرل محمد ضیاء الحق بیٹھے تھے جبکہ ان کے ساتھ چیئر مین جوائنٹ چیف آف سٹاف اور دس سال تک آئی ایس آئی کے سربراہ رہنے والے جنرل اختر عبدالرحمان بیٹھے تھے۔ اس وی آئی پی کیپسول کی دیگر

دو نشستوں میں سے ایک پر صدر ضیاء الحق کو پچھلے بارہ سال سے جاننے والے امریکی سفیر اوکیو اور دوسری پر پاکستان میں امریکی ملٹری مشن کے سربراہ جنرل ہربرٹ ایم رسم بیٹھے تھے۔ 29 مئی کو وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے برطرف کئے جانے کے بعد صدر ضیاء الحق کا پاک ون طیارے پر پہلا فضائی سفر تھا۔ صدر ضیاء الحق بادل ناخواستہ اس جگہ نئے امریکی ٹینک کا مظاہرہ دیکھنے آئے تھے کیونکہ وہ غالباً ایک ٹینک کو اپنے نشانے پر گولے داغنے کے مناظر کو دیکھنا بہت اہم تصور نہیں کرتے تھے۔ تاہم اپنے ایک سابق ملٹری سیکرٹری جو آرمڈ فورس کے کمانڈر تھے کے اس اصرار پر کہ اس موقع پر پوری فوجی قیادت کا موجود ہونا ضروری ہے، صدر ضیاء الحق نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ صدر ضیاء الحق ہیلی کاپٹر میں بہاولپور کے فوجی فضائی اڈے سے صحرا میں پہلے اس مقام تک گئے جہاں اس امریکی ٹینک کی کارکردگی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تاہم جنرل صاحب کو یہ دیکھ کر یقیناً شدید مایوسی ہوئی ہوگی کہ ٹینک نے دس مرتبہ اپنے ہدف پر گولے پھینکے اور دسوں گولے اپنے ٹارگٹ کو مس کرتے ہوئے دور جا گرے۔ صدر ضیاء الحق نے اس مایوس کن کارکردگی کو دیکھنے کے بعد افواج پاکستان کے ٹاپ جنرلز کے ساتھ آئس کریم کھائی، نماز ادا کی اور واپس اس طیارے میں سوار ہونے سے پہلے دیگر ساتھیوں سے ملے۔ جنرل ضیاء الحق کی طرح جنرل اختر عبدالرحمان کا اس سفر میں پہلے شامل ہونے کا ارادہ نہیں تھا لیکن جب ان کے آئی ایس آئی کے پرانے ماتحت نے انہیں یہ بتایا کہ صدر ضیاء الحق فوج کی اعلیٰ قیادت میں تبدیلیاں لانے والے ہیں اور یہ کہ اوجڑی کیمپ کے معاملے کا نزلہ ان پر گر سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ صدر ضیاء الحق کے ساتھ گزاریں تا کہ وہ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں، چنانچہ جنرل اختر عبدالرحمان نے اپنی کراچی کی ایک میٹنگ ملتوی کی اور بہاولپور صدر ضیاء الحق کے ساتھ پہنچ گئے۔ ٹینک کا مظاہرہ دیکھا اور صدر ضیاء کے ایک چیف آف جنرل اسٹاف محمد انور کے ساتھ سی 130 طیارے میں

سوار ہونے کے بعد صدر کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئے۔ امریکی سفیر اس دوران بہاولپور میں ایک ہفتہ پہلے قتل ہو جانے والی ایک راہبہ کی مقامی گرجے جا کے تعزیت بھی کر آئے تھے جبکہ اس وی آئی پی کیپسول کے پیچھے طیارے میں آٹھ دیگر جنرلز اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ روانہ ہوتے مسافروں کو وائس چیف آف اسٹاف یعنی لیفٹیننٹ جنرل اسلم بیگ نے رن وے پر الوداع کہا۔ جنرل بیگ اس دن اعلیٰ فوجی کمانڈ کے واحد جنرل تھے جو پاک ون طیارے میں سوار نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اسلام آباد واپس ایک چھوٹے طیارے میں جانا تھا جو پاک ون کے روانہ ہوتے ہی اپنی پرواز کیلئے رن وے پر تیار کھڑا تھا۔ صدر ضیاء الحق کے پاک ون کی پرواز سے پہلے ایک چھوٹے سیسنا سیکورٹی طیارے نے پرواز کا احتیاطی چکر لگایا۔ 8 سال پہلے صدر ضیاء الحق کے پاک ون طیارے پر روسی ساخت کے سیم سات میزائل کے فائر کیے جانے کے بعد یہ احتیاطی اقدام لازم قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد جیسے ہی کنٹرول ٹاور نے او کے کا سگنل دیا طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ طیارے کے پائلٹ ونگ کمانڈر مشہود حسن کا چناؤ خود صدر ضیاء الحق نے کیا تھا جبکہ ان کے ساتھ بیٹھے معاون پائلٹ کو کلیئرنس ایئر فورس نے دی تھی۔ اس پرواز سے ایک روز پہلے ہی یہ پوری ٹیم اس پاک ون طیارے کو عین اسی روٹ پر اسلام آباد سے بہاولپور تک اور پھر واپس لے کر گئی تھی تا کہ عین وقت پر کوئی غیر متوقع بدمزگی پیدا نہ ہو اور یہ تمام سفر تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا تھا۔

طیارے کے پہیوں نے جیسے ہی رن وے کی زمین کو الوداع کہا، بہاولپور کنٹرول ٹاور نے کیپٹن مشہود سے کہا ''پاک ون سٹینڈ بائے'' لیکن جواب میں خاموشی تھی۔ کنٹرول ٹاور نے پھر اپنا پیغام دیا لیکن پاک ون طیارہ پرواز کے چند ہی لمحات بعد کنٹرول ٹاور سے اپنا رابطہ توڑ چکا تھا۔ اسی دوران ہوائی اڈے سے کوئی 18 میل دور بہتے دریا کے کنارے کام کرتے دیہاتیوں نے فضاء میں تین قلابازیاں کھا کر تیزی سے نیچے آ کر صحرا کی ریت میں

دھنستے اس پاک ون طیارے کو دیکھا اور پھر ایک زوردار دھماکے کے بعد شعلوں نے طیارے اور اس میں سوار مسافروں کو نگل لیا۔

کئی گھنٹوں کی بدحواسی کے بعد سرکاری میڈیا نے آخر یہ اعلان کیا کہ صدر ضیاء الحق کا طیارہ پاک ون 31 مسافروں کے ساتھ بہاولپور کے قریب ایک چھوٹی سی بستی لال کمال کے نواح میں گر کر تباہ ہوگیا ہے۔ تین دن بعد مرحوم صدر کا جسد خاکی پورے اعزاز کیساتھ دارالحکومت اسلام آباد کے وسط میں اور مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں عالیشان فیصل مسجد کے وسیع وعریض احاطے میں دفنا دیا گیا۔ اس سے پہلے بیس اگست کو ہی ان کا جسد خاکی راولپنڈی میں ان کی رہائش گاہ آرمی ہاؤس سے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری بارہ سال گزارے تھے ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسلام آباد کے ایوان صدر میں لایا گیا۔ ایوان صدر سے تابوت ایک ایمبولینس میں رکھ کر مقام تدفین سے چند سو گز دور تک لایا گیا اور پھر پرچم میں 21 توپوں کی سلامی کے ساتھ ان سپاہیوں نے صدر ضیاء الحق کے تابوت کو لحد میں اتار دیا جن کی کئی سال تک صدر ضیاء نے کمانڈ کی تھی پھر صدر ضیاء الحق کے ساتھ یہ سوال بھی پاکستانی قوم کیساتھ دیگر لاتعداد سوالات کی طرح شاید ہمیشہ کے لئے رہ گیا کہ صدر ضیاء الحق کو کس نے اور کیوں ہلاک کیا؟

لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر بھٹو کے بر سر عام مارے جانے تک ایسے بے شمار سوالات آج بھی اپنے جوابات کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس پراسرار داستان کی اہم ترین گتھی شاید اس سوال کے جواب سے سلجھ سکتی تھی کہ آخری لمحات میں صدر ضیاء الحق کے طیارے کے پائلٹس پر کیا گزری کیوں حادثے کی تحقیقات کرنے والوں کو ملبے سے بلیک باکس یا کاک پٹ ریکارڈ نہیں ملا۔ اس وقت اسی فریکیونسی پر دیگر طیارے بھی موجود تھے۔ ایک اسلم بیگ کا جمبو جٹ تھا جو پاک ون کی پرواز کے بعد رن وے پر ٹیک آف کا انتظار کر

رہا تھا۔ایک پاک 379 طیارہ تھا جو صدر ضیاء الحق کے سی 130 پاک ون طیارے کے بیک اپ کے طور پر بہاولپور کے رن وے پر موجود تھا اور تیسرا وہ سیسنا جو سیکورٹی یا فوجی زبان میں مشاق طیارہ تھا جس کے بارے میں پہلے پروگرام میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ آٹھ سال پہلے صدر ضیاء الحق کے طیارے پر ایک میزائل فائر ہونے کے بعد ہمیشہ سے حفاظتی طور پر پاک ون کی پرواز سے پہلے فضا میں چکر کاٹ کے حفاظتی اقدامات کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ان دیگر تین طیاروں کا عملہ صدر ضیاء الحق کے پاک ون طیارے کے پائلٹ اور کنٹرول ٹاور کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا اور سب نے تقریباً ایک ہی طرح کے بیان دیئے کہ سب سے پہلے پاک ون نے راولپنڈی پہنچنے کا متوقع وقت بیان کیا پھر جب کنٹرول ٹاور نے پاک ون سے ان کی جگہ دریافت کی تو جواب میں خاموشی تھی اس خاموشی نے جب طوالت پکڑی تو کنٹرول ٹاور ضیاء الحق کے پائلٹ ونگ کمانڈر مشہود حسن سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔تین منٹ مزید گزر گئے تو پھر صدر ضیاء الحق کے پاک ون طیارے سے ایک مدہم سی آواز آئی ''مشہود'' ''مشہود'' آس پاس موجود طیاروں کے پائلٹس نے یہ آواز پہچانی اور زیادہ تر کا خیال یہی ہے کہ یہ صدر ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نجیب احمد کی آواز تھی۔نجیب احمد سمیت دیگر تمام افسران وی آئی پی کیپسول میں نہیں بلکہ اس کے یعنی صدر ضیاء الحق، اختر عبدالرحمان اور دو امریکن کے پیچھے والے حصے میں طیارے کے اندر بیٹھے تھے۔اس مدہم آواز کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت طیارے کا ریڈیو آن تھا اور وہ یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ کنٹرول ٹاور کے بار بار چلّانے کے باوجود پائلٹ مشہود حسن اور دیگر عملہ خاموش تھا اگر یہ عملہ کسی بھی مشکل کا شکار ہو چکا تھا تو اسے کنٹرول ٹاور کو فوراً اس مشکل سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا۔خصوصاً تب جب یہ سی 130 طیارہ فضا میں قلابازی لگا رہا تھا یا ئلٹ کمانڈر مشہود حسن خاموش کیوں رہے۔اگر کسی بھی انداز میں طیارہ ان کے کنٹرول

سے باہر ہو رہا تھا تو وہ کم سے کم ہنگامی سگنل ضرور دے سکتے تھے یا پھر چلا کر اپنے ماتحت عملے یا طیارے میں سوار دیگر مسافروں کو ہنگامی لینڈنگ کے بارے میں بتا سکتے تھے اگر طیارے میں ہائی جیکنگ کی بھی کوئی کوشش ہو رہی تھی تو وہ بھی باہر سنی جا سکتی تھی مگر ایسا بھی نہیں ہوا اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہوا تو پھر طیارہ قلابازیاں لگانے کے بعد تیزی سے زمین پر کریش ہونے جا رہا تھا تو کم سے کم اس وقت مسافروں کی چیخیں سنی جا سکتی تھیں کیونکہ ریڈیو آن تھا۔ لیکن یہ بھی نہیں ہوا اور اس معمہ کی صرف ایک ہی توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ونگ کمانڈر مشہود حسن اور انکا معاون عملہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا پھر دم توڑ گیا تھا اور ان میں سے کسی کے ہاتھ کے دباؤ کی وجہ سے مائیکروفون کھلا رہ گیا تھا جس سے کچھ دیر بعد مشہود کو کسی شخص کے پکارے جانے کی صدا سنی جا سکی تھی۔ یہ بات واضح نہیں کہ یہ ریکارڈ تک اب بھی کسی جگہ موجود ہے یا نہیں یا پھر یہ کہ ان ریکارڈنگ میں سے اسٹیٹک کو باقی بیک گراؤنڈ ساؤنڈ سے جدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش کی گئی یا نہیں۔ ایک صاحب کا اصرار ہے کہ انہوں نے خود یہ ریکارڈنگ سنی تھی جس میں جہاز کریش ہونے سے پہلے کسی نے مشہود کو پکارا تھا لیکن بہاولپور کے کنٹرول ٹاور کے مطابق ان کے پاس اس آخری گفتگو کی کوئی ریکارڈنگ نہیں کی گئی نہیں کی گئی تاہم ہو سکتا ہے کہ ان کے مطابق چالیس میل دور ملتان ایئر پورٹ پر اس لئے یہ گفتگو ریکارڈ نہیں ہوئی اگر سی 130 طیارے کا پائلٹ جہاز کا کنٹرول چھوڑ دے تو جہاز کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس طیارے کو بنانے والے ادارے کے ماہرین کا کہنا ہے کہ طیارہ ایک مخصوص فیگوائڈ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔

پہلے وہ تیزی سے نیچے کی طرف جاتا ہے پھر طیارے کی دم میں موجود ایک مخصوص نظام بحال ہو کر طیارے کے اگلے حصے کو عارضی طور پر اوپر اٹھاتا ہے اور اگر اس دوران پھر بھی کوئی شخص جہاز کو کنٹرول نہ کرے تو پھر وہ دوبارہ نیچے غوطہ لگاتا ہے اور ہر غوطے کے ساتھ

طیارے کی بلندی کم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار وہ کریش ہو جاتا ہے صدر ضیاء الحق کے طیارے کے بارے میں ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس نے تباہی سے پہلے اس طرح کم سے کم تین مرتبہ غوطے لگائے اور عینی شاہدین بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ پائلٹ اور ان کے معاونین اگر ہوش وحواس میں ہوتے تو ان کے پاس طیارے کو کنٹرول کرنے کے کم سے کم تین مواقع تھے۔ طیارے کے ماہرین کا خیال یہ بھی ہے کہ ہوسکتا ہے صدر ضیاء الحق کے طیارے کی ایئر ونڈ میں ایک ایسا گیس بم رکھا گیا ہے جو ٹیک آف کے فوراً بعد کاک پٹ میں پریشرائزڈ ہوکر داخل ہونے لگی تو وہ پھٹ گیا۔ یہ بم نصب کرنا شاید یوں دشوار نہ رہا ہوگا کہ اس روز معمول کے ایک ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے طیارے کو بہاولپور کے ہوائی اڈے پر ہی کھڑا رکھا گیا تھا۔ ضوابط کے مطابق صدر ضیاء الحق کے پاک ون طیارے کو قریبی ملتان ایئر بیس پر مکمل حفاظتی حصار میں کھڑا رکھنا چاہیے تھا۔ بہاولپور ایئر پورٹ پر اس روز موجود ایک صاحب کا کہنا ہے کہ اس دن صدر ضیاء الحق کے اس پاک ون طیارے کے کارگو دروازے کی مرمت کا کام بہاولپور رن وے پر دو گھنٹے تک کیا گیا اور مرمت کرنے والوں میں چند سویلین بھی شامل تھے۔ مرمت کرنے والے بار بار جہاز کے اندر اور باہر تلاشی کے بغیر آتے جاتے رہے۔ ہوسکتا ہے تب طیارے میں کوئی گیس بم نصب کر دیا گیا ہوا اگر پائلٹس کے خاموش ہو جانے کی وجہ کوئی زہریلی گیس تصور کر لی جائے تو پھر کون سی گیس اس مقصد کیلئے استعمال ہوئی ہوگی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایسی کسی گیس کا حصول جو چند لمحات میں سانس لینے والوں کو مفلوج کر سکے کسی بھی حساس ادارے یا زیر زمین تنظیموں سے رابطہ رکھنے والوں کیلئے دشوار نہیں ہوتا۔ چند افراد یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسی زہریلی گیس چند لمحات میں پائلٹ کو اس طرح ختم کر دے کہ اس کا ہاتھ بھی مائیکروفون پر رکھا رہ جائے۔

یہ افغانستان میں سوویت یونین کے ساتھ جنگ میں استعمال ہوتی رہی امریکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ نمبر 78 جن کا عنوان کیمیکل وار فیئر ساؤتھ ایشیا اینڈ افغانستان تھا اس میں ان افغان مجاہدین کی لاشوں کا تذکرہ کیا گیا تھا جو اس قسم کی گیس کو سونگھنے کے بعد اپنی رائفلز سے نشانے لگاتے ہوئے اس پوزیشن میں بندوقوں کو رکھ کے دم توڑ گئے تھے۔ سوویت کون سی گیس استعمال کرتے تھے میں نہیں کہہ سکتا لیکن امریکن شہر میری لینڈ کے یو ایس آرمی کیمیکل سنٹر کے ایک سائنس دان کے مطابق اس قسم کی یو گیس امریکہ ضرور تیار کرتا ہے۔ بے رنگ اور بے بو یہ گیس آسانی سے لیکوڈ حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکتی ہے اور ایک چھوٹے سے سوڈا سائز کین میں موجود گیس ایک چھوٹے سے دھماکے کے ساتھ اگر پھیلا دی جائے تو اس قابل ہوتی ہے کہ وہ چند ہی لمحات میں سانس لینے والوں کو مکمل طور پر مفلوج کر سکتی ہے اور ماہرین کے مطابق یہ اپنا واحد نشان پیچھے فاسفورس کی شکل میں چھوڑتی ہے۔

وہ فاسفورس جو صدر ضیاء الحق کے تباہ شدہ طیارے کے کاک پٹ میں بہت بڑی مقدار میں موجود تھا۔ اس طرح کی صورت میں دیگر شواہد بھی تلاش ہو سکتے تھے۔ اگر کسی زہریلی گیس سے پائلٹ بے ہوش یا ہلاک ہو گئے تھے تو ان کی لاشوں کا پوسٹمارٹم اس نظریئے کی تصدیق یا تردید کر سکتا تھا اگر ایسی کوئی زہریلی گیس استعمال ہوئی تو اس کا سراغ ان ممالک تک لگایا جا سکتا تھا جہاں یہ تیار ہوتی ہے جہاں سے اسے بین الاقوامی بارڈر کراس کر کے لایا گیا ہو گا اور پھر ایک ڈیٹونیٹر اور فیوز مکینیکل کے ساتھ جوڑ کر ایک ایسے بم کی شکل دے دی گئی ہو گی جو طیارے کے ٹیک آف کے ساتھ ہی پھٹ سکے۔ سکاٹ لینڈ کی فضاؤں میں تباہ ہونے والے سی 130 کی تحقیقات کے دوران آخر کار پھٹنے والے بم تیار کرنے والوں تک تحقیقاتی ادارے پہنچ گئے تھے۔ پاکستان میں تو یہ سب کچھ ایک ملٹری ایئر بیس پر ہوا تھا اور ایسا

کرنے والے اور پھر اس کی منصوبہ بندی کرنے والے صدر ضیاء الحق کی حرکات وسکنات، حفاظتی اقدامات کے نتائج اور پاک ون طیارے کے آپریشن سے یقیناً مکمل طور پر آگاہ تھے۔ زیادہ سے زیادہ کتنے لوگ بہاولپور کے رن وے پر ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ ایک عام سادہ لیکن شفاف پولیس انوسٹی گیشن بھی شاید ذمہ داران کے گریبان تک پہنچ سکتی تھی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا۔ حادثے کے فوراً بعد حکومت نے حادثے کی تحقیقات کا کام ایئر فورس کے سپرد کر دیا تھا اور چیف آف ایئر سٹاف ایئر چیف مارشل کلیم اللہ خان نے 17 اگست ہی کو ایک چار رکنی بورڈ آف انکوائری قائم کر دیا تھا جس کے ساتھ امریکہ سے آنے والی چھ رکنی ٹیم بھی شامل کر دی گئی تھی اور ان تمام لوگوں میں اس حادثے کی تخریبی پہلو کے بارے میں تحقیقات کا معائنہ نہیں ہوا۔ امریکہ میں نیشنل سیکورٹی کے ڈپٹی ایڈوائزر رابرٹ اوکلے جنہوں نے 17 اگست کو ایف بی آئی کی ٹیم کو پاکستان آنے سے روکنے میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا وہ حادثے کے بعد پاکستان میں امریکی سفیر مقرر کر دیئے گئے اس بورڈ آف انکوائری کی رپورٹ کے بارے میں کسی بھی مکینیکل فیلیئر کو خارج از امکان قرار دیتے ہوئے مجرمانہ کارروائی کا شک ظاہر کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کے پیراگراف 33 میں یہ بھی لکھا ہے کہ فلائی ٹیک پر جو لوگ موجود تھے یا طیارے کے عملے کی لاشوں کا اگر با قاعدہ پوسٹ مارٹم کرایا جاتا تو لازم تھا کہ کچھ نہ کچھ سراغ مل جاتا۔ یعنی پائلٹ یا عملے سمیت کسی بھی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا ہی نہیں گیا۔ بہاولپور کے ملٹری ہسپتال کا کہنا ہے کہ سترہ اگست کی رات مرنے والوں کی لاشوں کے ٹکڑے پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر کے پوسٹ مارٹم کیلئے لائے گئے تھے اور یہ کام پاکستانی اور امریکی ماہرین کی ٹیم اٹھارہ اگست کو کرنے والی تھی۔ لیکن جنرل ہیڈ کوارٹر سے جنرل اسلم بیگ کی بہاولپور کے کور کمانڈر کو ہدایات موصول ہو رہی تھیں کہ مرنے والوں کے بچے کھچے اعضاء جلد سے جلد راولپنڈی بھیجے جائیں اور پوسٹ

مارٹم نہ بھی ہوتو کوئی حرج نہیں۔ جنرل کے ایم عارف اپنی کتاب ضیاء الحق کے ہمراہ میں لکھتے ہیں کہ یہ ہدایت جی ایچ کیو کے اندرونی فون پر شمیم عالم خان کو دیں گئیں جنھوں نے یہ بہاولپور کے کور کمانڈر تک پہنچا دیں۔ ارباب اختیار کا موقف یہ رہا کہ بیشتر لاشیں کیونکہ ناقابل شناخت تھیں اوران کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ان کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا حالات کا تقاضا چنانچہ یہی تھا کہ جلد سے جلد تابوت تیار کئے جائیں۔ اور ورثاء کو پہنچا دیئے جائیں یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کیونکہ طیارہ گرنے کے فوراً بعد آگ کے ایک گولے میں تبدیل ہوگیا اس آگ کو جہاز پر لدے بیس ہزار پاؤنڈ ایندھن سے غذا مل رہی تھی اور چار گھنٹوں تک یہ آگ بجھائی نہیں جاسکی۔ چنانچہ فضائیہ کی انکوائری بورڈ کی طرف سے پوسٹ مارٹم نہ ہونے کی وجہ سے رپورٹ آنے کے بعد صدر غلام اسحٰق خان کی طرف سے ایس کے بندیال جو کہ ایک سویلین آفیسر تھے انہوں نے یہ بیان کیا کہ جلی ہوئی ہڈیاں اور گوشت کے آتش زدہ دو ہی ٹکڑے باقی بچے تھے لہذا پوسٹ مارٹم صرف ایک پھیپھڑے کا ہوا جو کہ امریکی ملٹری اتاشی جنرل واسم کا تھا اور ایک گردے کا جو سینئر ٹیکنیشن اصغر مرحوم کا تھا۔ ایک ڈائجسٹ کی رپورٹ میں اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ حادثے کے بعد ملنے والی بعض لاشیں جن میں عملے کی لاشیں بھی تھیں بڑی حد تک ٹھیک حالت میں تھیں اور یہی موقف صدر ضیاء الحق کے صاحبزادے اعجاز الحق کا بھی تھا۔ جو انہوں نے ایس کے بندیال کو تحریر کیا۔ اعجاز الحق نے اس خط میں لکھا کہ حکومت کا یہ دعویٰ کہ سی 130 سے کوئی ایسی چیز نہیں بچی تھی جس کا کیمیکل تجزیہ ہوسکتا یا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا وہ غلط ہے۔ اعجاز الحق کے مطابق ان کے خاندان کو ان کے والد کی کئی ذاتی اشیاء پہنچائی گئیں تھیں جن میں قرآن کریم کا نسخہ ان کے کپڑے اور کاغذات شامل تھے۔ اعجاز الحق کے مطابق ان اشیاء کو لانے والے وہ لوگ تھے کہ جنھوں نے ان اشیاء کو موقع پر پایا اور ان کو کہا گیا تھا کہ ان اشیاء کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔

اعجاز الحق نے حیرت کا اظہار کیا تھا کہ اگر جہاز کی ہر شے بشمول انسانی جسم اس طرح تباہ ہو گئے تھے کہ پوسٹ مارٹم ممکن نہیں تھا تو پھر کپڑے کیسے محفوظ رہ گئے یہ بھی وضاحت یہاں ضروری ہے کہ پاک فضائیہ کی انکوائری رپورٹ میں یہ کہیں نہیں لکھا گیا تھا کہ پوسٹ مارٹم کا نہ ہونا بدقسمتی ہے۔ تمام تابوت ایئر پورٹ پر پہنچے جن میں صدر ضیاء الحق کے علاوہ امریکی سفیر اور ملٹری اتاشی بریگیڈیئر واسم بھی شامل تھے۔

ایئر پورٹ پر ہی دونوں امریکیوں کے تابوت امریکی سفارت خانے کے حوالے کر دیئے بریگیڈیئر واسم کے تابوت میں صرف گھٹنے کے نیچے کا دایاں پاؤں جسے امریکی فوج کے سبز جوتے کی وجہ سے پہچانا گیا جبکہ لاش پوری کرنے کے لئے ایک پاکستانی جنرل کا بغیر سر کا جسم تابوت میں رکھ دیا گیا تھا جسے 19 اگست کو امریکیوں نے واپس پاکستان بھیج دیا تھا اس بات کا اعتراف امریکی ٹیم کے جنرل جارج کرائس نے 13 جولائی 1989ء کو امریکی کانگریس کی سب کمیٹیوں کے سامنے کیا۔ تھا یعنی یہ بات بھی ایک معمہ بن گئی کہ اگر بریگیڈیئر واسم کے نام پر جانے والی لاش امریکیوں نے 19 اگست کو لوٹا دی تھی اور جسے 20 اگست کی شب اسلام آباد کے قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا تو پھر وہ تجزیاتی رپورٹ کس کی تھی جو بریگیڈیئر واسم کے نام سے جاری کر کے 22 اگست کو پاکستان کی انکوائری ٹیم کو بھیج دی گئی تھی۔ صدر ضیاء الحق کے طیارے کی داستان آموں کی ان پیٹیوں کے بغیر نامکمل ہے جو میجر جنرل محمود علی درانی کی نگرانی میں میجر افضال اور میجر سلیم محمود نے بند کی تھیں یہ پیٹیاں تامباواں وانڈی کے علاقے سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے بہاولپور لائی گئیں تھیں اس سامان کو نائب صوبیدار شفیق اور جان محمد نے لوڈ کرایا تھا اور یہ صدر ضیاء الحق کیلئے جنرل محمود درانی کا تحفہ تھا۔ جنرل درانی ایک دور میں صدر ضیاء کے ملٹری سیکرٹری تھے اور انہی کے اصرار پر ضیاء الحق بہاولپور ٹینک کا مظاہرہ دیکھنے آئے تھے۔ لیکن جنرل کے ایم عارف جنرل محمود علی درانی کو تمام شک و

شبے سے بالاتر قرار دیتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ جنرل ضیاءالحق خود یہ مظاہرہ دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے ایک اور بات یہ کہ صدر ضیاء کے طیارے پاک ون کو اڑانے کی اصل ذمہ داری کیپٹن مشہود کی نہیں بلکہ اس روز صباحت اے مفتی کی تھی گروپ کیپٹن نے مشہود حسن سے درخواست کی تھی کہ اس روز پاک ون کو بہاولپور اڑا کے لے جائیں کیونکہ وہ خود پی آئی اے کی ایک آزمائشی پرواز کو کراچی لے جا رہے ہیں چند افراد کا کہنا ہے کہ جہاز کریش ہونے سے کچھ دیر پہلے جو مشہود مشہود کی آواز سنی گئی تھی وہ صدر ضیاء کے ملٹری سیکرٹری نذیر احمد کی نہیں بلکہ گروپ کیپٹن صباحت مفتی کی تھی۔ جو بہت اوپر کہیں فضاء میں پی آئی اے کا طیارہ کراچی سے واپس لا رہے تھے اور تین بج کر 49 منٹ پر وہ عین بہاولپور کے اوپر تھے جب ان کے طیارے نے پاک ون کے بارے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تو کیپٹن مفتی نے وائر لیس کے ذریعے مشہود کو پیغام دیا تھا۔ تحقیقات کا رخ غلط سمت موڑنے کی اور بھی کئی کوششیں جاری رہیں اس لئے 16 سال گزرنے کے باوجود بھی یہ تمام سوال حل طلب ہیں؟

17 اگست 2004ء

امن نوبل انعام

کرہ ارض پر بسنے والے ان تمام انسانوں کو جو اس دھرتی پر امن و آشتی کے خواہاں ہیں، جنگ و جدل سے نفرت کرتے ہیں، ہر روز مختلف ممالک سے بے گناہوں کی ہلاکتوں کی خبروں پر ماتم کیا کرتے ہیں، یہ خبر شاید ان کے اعصاب پر گراں گزرے کہ سالِ رواں کے امن نوبل انعام کے لئے نامزد ہونے والی شخصیات میں سرفہرست امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش اور برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر بھی ہیں۔ ان کو نامزد کرنے والے دائیں بازو کے نورویجن پارٹی کے قانون دان جین سمونسر نے نامزدگی کی وجہ یہ تحریر کی ہے کہ دونوں رہنماؤں نے مشرق وسطی کے ایک ڈکٹیٹر صدام حسین کو اس کے عہدے سے ہٹا کر وہاں ایک تباہ کن ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگ کے امکانات ختم کر کے ایک جمہوری معاشرے کی بنیاد ڈالی ہے محض نامزد ہو جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ان شخصیات کو واقعی نوبل امن انعام ملنے جا رہا ہے لیکن فرض کریں کہ اگر یہ فیصلہ کر لیا گیا تو یہ کیا تاثرات مرتب کرے گا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نامزدگیوں کی آخری تاریخ یکم فروری تھی اور آج 13 فروری ناروے میں موجود پانچ رکنی کمیٹی کے تمام نامزدگیوں کی نمبر شماری مکمل کر لینے کے بعد یکم مارچ کے پہلے اجلاس میں ان تمام نامزدگیوں کو حتمی شکل دے دی جائے گی۔ یہ کمیٹی خود تو نامزدگیاں خفیہ رکھتی ہے لیکن دنیا بھر سے نامزدگیاں کرنے والے لوگ اپنے نامزد امیدواروں کے ناموں کا اعلان کر دیا کرتے ہیں جیسا کہ بلیئر اور بش کو نامزد کرنے والے وکیل نے کیا ہے۔ جن نامزد

امیدواروں کے نام سامنے آچکے ہیں ان میں پوپ جان پال دوم اور چیک ریپبلک کے سابق صدر ڈ کلائق ہیون بھی شامل ہیں باقی نامزدگیاں کن شخصیات کی ہوئیں اب تک ہم ان سے لاعلم ہیں لیکن 22 جنوری کو واشنگٹن پوسٹ سے جمیز اوگلینڈ لکھ چکا ہے کہ بھارت کی طرف سے سرد مہری اور پاکستان کی طرف سے گرم جوشی کا ملاپ ممکنہ طور پر پاکستان اور بھارت کے دونوں رہنماؤں کے لئے امن نوبل انعام لا سکتے ہیں۔ یہ اب تک واضح نہیں ہو پارہا کہ کسی نے نئی دہلی سے جو کہ اوسلو میں نامزدگیاں جمع کرتے دفتر سے 3724 میل دور تھا یا پھر اسلام آباد سے جو کہ وہاں سے 3692 میل دور تھا دونوں رہنماؤں کے کاغذات نامزدگی بھیجے یا نہیں۔ کسی نے اب تک اعلان تو نہیں کیا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ شاید ایسا ضرور کیا گیا ہو۔

ہمارے قومی اسمبلی کا کوئی بھی رکن یا کسی جامعہ کا وائس چانسلر، سوشل سائنٹسٹ، قاری، فلسفے یا مذہب کا کوئی پروفیسر نامزدگی بھیجنے کا حق رکھتا ہے۔

یہ نوبل انعام اس کیمیا دان الفرڈ نوبل سے وابستہ ہے جو سٹاک ہوم سویڈن میں 1835ء کو پیدا ہوا تھا جس نے 1866ء میں ڈائنامائٹ سمیت 355 دیگر ایجادات بھی کی تھیں اس نے تمام زندگی کسی سکول، کالج یا یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی۔ کوئی امتحان پاس نہیں کیا اور دنیا کے 20 ممالک میں اپنی تجربہ گاہیں اور ادارے تعمیر کر دینے کے بعد جب وہ 10 دسمبر 1896ء کو اٹلی میں دماغ کی شریان پھٹنے سے انتقال کر گیا تو اگلے جنوری میں اس کی وہ وصیت سامنے لائی گئی جو اس کے مرنے سے ایک سال پہلے یعنی 27 نومبر 1895ء کو پیرس کے نارو تجین کلب میں بند کر کے رکھ دی گئی تھی۔ اس وصیت کے مطابق الفرڈ نوبل نے 500 سو ملین ڈالرز کے لگ بھگ چھوڑی گئی اپنی دولت اور اس سے حاصل ہونے والا سالانہ منافع کو ان لوگوں کے اعزاز میں دیئے جانے کے لئے مختص کر دیا تھا جنہوں نے بنی

نوع انسان کی بھلائی کے لئے کوئی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

امن نوبل انعام واحد انعام ہے جو ناروے کے دارالحکومت اوسلو سے دیا جاتا ہے باقی تمام نوبل انعامات سٹاک ہوم میں دیئے جاتے ہیں۔ امن انعام کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کا نام ناروے کی 165 رکنی پارلیمنٹ طے کرتی ہے اور باقی نوبل انعامات کے برعکس نوبل امن انعام ان فلاحی اداروں کو بھی دیا جاتا ہے جو اپنے مشن کے لئے کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ باقی انعامات کے لئے مشن کا مکمل ہونا لازمی ہے۔

ان انعام کی قیمت آج 1.2 ملین ڈالرز ہیں اور ایک سے زیادہ شخصیات کو یہ انعام ملنے کی صورت میں رقم برابر تقسیم ہو جاتی ہے۔ پچھلے چار سال کے دوران متعدد شخصیات کے علاوہ چند اداروں جیسے اقوام متحدہ کا ادارہ برائے مہاجرین وغیرہ کو یہ انعام دیا گیا ہے۔ 1901ء میں پہلے انعام کے اجراء کے بعد نوبل امن انعام پانے والی 90 شخصیات میں کئی اہم نام بھی نظر آتے ہیں مثلاً امریکہ کے 36 ویں صدر روز ویلٹ کو امن نوبل انعام اس لئے دیا گیا تھا کہ اس نے روس اور جاپان کے درمیان جنگ ختم کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ کسی بھی شعبہ میں نوبل انعام لینے والا وہ پہلا امریکی تھا اور وہ پہلا امریکی صدر بھی تھا جس نے 9 نومبر 1906ء کو امریکی سرزمین سے اس وقت پہلا قدم باہر رکھا تھا جب وہ نہر پانامہ کی تعمیر کا معائنہ کرنے وہاں گیا تھا۔ وہ پہلا امریکی صدر تھا جو 11 اکتوبر 1910ء کو ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا اور وہی پہلا امریکی صدر تھا جن نے 1905ء میں UAS لنگر نامی آبدوز سے سمندر میں غوطہ بھی لگایا تھا روز ویلٹ کو دنیا کے بچے آج اس حوالے سے یاد رکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ شکار کے دوران روز ویلٹ نے ایک ریچھ کے بچے کو مارنے سے منع کر دیا تھا۔ صدر روز ویلٹ کا گھریلو نام ٹیڈی تھا چنانچہ اس نام کی مناسبت سے دنیا بھر کے کھلونے بنانے والوں نے ٹیڈی کے بیئرز بنانے شروع کر دیئے تھے۔

امن نوبل پانے والوں کی فہرست میں مجھے سیاہ فاموں کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتا مارٹن لوتھر کنگ بھی نظر آیا۔ مارٹن لوتھر کنگ کو 1964ء میں کم عمر ترین انعام یافتہ شخص ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس نے سیاہ فاموں کے لئے آواز بلند کرنے کے علاوہ ویت نام جنگ کی بھی مخالفت کی جس کے بعد 4 اپریل 1968ء کو ایک ہوٹل کے کمرے میں اس وقت گولی ماردی گئی جب انہیں ایک جلسے سے خطاب کرنا تھا۔

18 جنوری 1993ء سے امریکہ کی تمام ریاستوں میں یوم مارٹن لوتھر کنگ کے موقع پر عام تعطیل ہوتی ہے۔

امن نوبل انعام یافتہ افراد کی فہرست میں 1985ء سے 1991ء تک اقتدار میں رہنے والے روسی صدر گورباچوف بھی نظر آئے ہیں۔ انہیں اس سرد جنگ کے خاتمے کے لئے انعام دیا گیا جو دنیا بھر میں 1945ء میں لڑی گئی۔ یہ سرد جنگ مغربی بلاک جیسے امریکہ اور نیٹو میں شامل اتحادیوں اور مشرقی بلاک جس میں اس وقت کا سوویت یونین اور اس کے اتحادی ممالک شامل تھے کے درمیان لڑی گئی۔

کیونکہ مغرب اور ایشیا کی باقاعدہ کبھی لڑائی نہیں ہوئی اس لئے سرد جنگ کی اصطلاح استعمال کی گئی جو میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، ثقافتی، جاسوسی سے لڑی گئی۔ مغرب اسے آمریت اور کمیونزم کے خلاف جبکہ مشرق اسے سامراجیت کے خلاف معرکہ کہتا ہے۔ سرد جنگ کے دوران کئی اور لڑائیوں مثلاً ویت نام، افغانستان، کوریا میں دونوں بلاکوں کے درمیان مسلح تصادم کی فضا پیدا ہوئی۔ 1988ء میں مشرقی یورپین ممالک نے کمیونزم کا خاتمہ اور جمہوریت لانے کا اعلان کر دیا۔ جس کے بعد مشرقی یورپ میں ایک ایک کر کے کمیونزم کا ڈھانچہ گرتا گیا اور رومانیہ کے علاوہ تمام دوسرے ممالک میں یہ تبدیلی پر امن انداز میں رونما ہو رہی ہے لیکن اس کے نتیجے میں خود روس کی کمیونسٹ پارٹی ٹکڑے

ٹکڑے ہوگئی۔ گورباچوف 1990ء کا نوبل انعام لینے اور مغرب سے تعریف وتوصیف کا مستحق قرار پائے جانے کے باوجود اپنے وطن میں غدار کہلایا اور ٹی وی پر اس کی آخری معروف آمد پیزا ہٹ کا ایک اشتہار تھا جو امریکی ٹی وی پر 1997ء کے دوران چلایا جاتا رہا۔ نوبل انعام یافتہ شخصیات کی فہرست میں 1943ء میں اپنے والدین کے ساتھ جرمنی سے فرار ہوکر نیویارک پہنچنے والا ایک یہودی بچہ بھی تھا جو بعد میں ہنری کسنجر کہلایا۔ ہنری کسنجر کو صدر نکسن 1973ء میں نوبل انعام کا حقدار ویت نام کے لی ڈک تھو کے ساتھ مشترکہ طور پر دیا گیا۔ ویت نامی لیڈر نے کسنجر کے ساتھ نوبل انعام میں شرکت سے انکار کرتے ہوئے اپنے نوبل انعام کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ میں اس قاتل کے ساتھ اس اعزاز میں شریک نہیں ہوسکتا جس نے کمبوڈیا اور لاؤس پر بمباری کا حکم دے کے 6لاکھ بے گناہوں کو قتل کیا اسی نوبل امن یافتہ فہرست میں انور سادات اور بیگن کے نام بھی نظر آئے جنہوں نے مشترکہ طور پہ اسرائیل اور مصر کے درمیان امن معاہدے کے سلسلے میں 1978ء کا امن نوبل انعام پایا تھا۔ کیمپ ڈیوڈ کے اس معاہدے پر دستخط کرنے والے انور سادات 6اکتوبر 1981ء کو ایک فوجی پریڈ کے دوران سلامی لیتے ہوئے مارے گئے تھے۔ دوسرے دستخط کرنے والے اسرائیلی وزیراعظم بیگن۔ 1982ء میں لبنان پر چڑھائی کردی تھی اور اس ناکام کارروائی کے ایک سال بعد وہ سیاست سے دستبردار ہوگیا اور 10 سال تک یروشلم میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہنے کے بعد گمنامی میں مرگیا۔

اس فہرست میں یاسر عرفات کے ساتھ 1994ء کے امن نوبل انعام میں شریک اسرائیلی وزیراعظم روبن بھی ہے جو کہ اگلے ہی سال نومبر 1995ء میں اپنے ہاں ایک کٹر یہودی کی گولی کا نشانہ بنا۔ امن کے نوبل انعام یافتگان کی فہرست میں صرف ایک فوجی جنرل گزرے اور یہ جنرل جارج مارشل تھے جو 1945ء تک امریکی فوج کے سربراہ رہے

اور انہیں جنگ عظیم دوئم کے بعد یورپی ممالک کی از سر نو تعمیر کے منصوبے جسے اب تاریخ میں مارشل پلین کہتے ہیں کے خالق ہونے کے ناطے نوبل انعام ملا تھا۔

اگر صدر مشرف اس سال نوبل انعام کے حق دار ہو جاتے ہیں تو وہ تاریخ کے دوسرے فوجی ہوں گے جو اس انعام کا حقدار ٹھہرے گا اگر کسی جانب سے بھی مشرف کی نامزدگی بھیجی گئی ہے اور وہ منظور ہو جاتی ہے تو پھر انہیں یہ انعام 10 دسمبر اسی سال دیا جائے گا۔ یہ وہ تاریخ ہوگی جس کے 20 دن بعد جنرل مشرف LFO کے سمجھوتے کے تحت اپنے فوجی عہدے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ صدر جارج بش تو بہر حال واضح امیدوار برائے نوبل انعام میدان میں آ چکے ہیں۔ یہ لوگ اس سے ایک ماہ پہلے یعنی نومبر میں انتخابی معرکے سے گزر کر سابق صدر کہلائے جانے کا کارسک رکھتے ہیں اور یہی صورتحال اٹل بہاری واجپائی جی کو مئی میں درپیش الیکشنز کے دوران پیش آ سکتی ہے اور واضح رہے کہ ٹونی بلیئر بھی کسی بھی وقت سال رواں کے دوران غیر متوقع الیکشنز کا اعلان کر کے ان کا سامنا کر سکتے ہیں۔

امن نوبل انعام برصغیر میں آنا چاہئے یا وائٹ ہاؤس اور 10 ڈاؤننگ سٹریٹ کی طرف جانا چاہئے۔ یہ بات قابلِ غور ہے!!

14 فروری 2004ء

عورت اور ''کاروکاری''

ایک جرمن مورخ خاتون نے ایک جگہ کہا کہ میرا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ واقعی بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں عورت کا وجود تو ہے لیکن صرف وہی وجود ہے جو مرد نے تشکیل دیا ہے کیونکہ ہماری پوری تاریخ مردوں کی تاریخ ہے عورتوں کی نہیں اس لئے اگر وہ تاریخ کے صفحات پر ابھرتی ہے تو ان کا کردار اور امر مرد کے تابع ہوتا ہے۔

ابتدائی دور میں جب قبیلوں میں باہمی جنگ و جدل ہوا کرتی تھی تو اس کے بعد دوستی کے معاہدوں میں شادی بیاہ کے ذریعے تعلقات بہتر بنائے جاتے مثلاً آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں یہ رواج تھا کہ وہ مخالف قبائل سے دوستی کیلئے اپنی عورتوں کو ان کے حوالے کردیا کرتے تھے اور یہی رواج دوسرے قبائل کے ہاں بھی رائج تھا کہ وہ بہتر تعلقات کیلئے عورتوں کو اپنے دشمنوں کے حوالے کرکے دشمنوں کا خاتمہ کردیا کرتے۔ عزت اور تخت و تاج بچانے کیلئے بھی عورتوں کو قربان کیا جاتا تھا مثلاً مغل بادشاہ بابر جب ثمرقند میں تھا تو اس

کے جانی دشمن شیوانی خان نے ثمرقند کا محاصرہ کرلیا۔اس کے فرار یا کامیابی کی کوئی امید نہ رہی تو ظہیرالدین بابر نے اپنی خانزادہ بیگم کو شیوانی خان کے حوالے کیا اور خود وہاں سے فرار ہو گیا اس طرح راجپوت خاندانوں نے اکبر بادشاہ کو اپنی لڑکیاں پیش کر کے مغل خاندان اور سلطنت کا حصہ بن کر مراعات حاصل کیں اور اس سارے عمل کا المیہ یہ تھا کہ عورت اس قربانی کے بعد تاریخ میں گم ہو جاتی اس کا کردار ختم ہو جاتا اور مرد اس سے پورا فائدہ اٹھایا کرتے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ قربانی اس شے کو کہا جاتا تھا جو جائیداد کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی۔مثلاً ایک عرصے تک غلاموں کو دیوتاؤں پر قربان کیا جاتا رہا پھر جانوروں کی بھی قربانی شروع ہوگئی اور پھر اس قربانی میں عورت کو بھی شامل کر دیا گیا۔انہیں صدیوں سے دیوتاؤں کی خوشیوں کی خاطر قربان کیا جاتا اور کبھی دریاؤں کی طغیانی سے بچاؤ کیلئے تاریخ میں عورت کی قربانی کا تذکرہ بھی آتا ہے۔

جب جنگ کے خاتمہ کے بعد مال غنیمت جمع کیا جاتا اور اس میں سب سے اہم حصہ لونڈیاں ہوتیں تو ان کی تقسیم بھی اسی انداز میں ہوتی جیسے ہیرے جواہرات، کپڑوں اور قالینوں کی۔جنگی قیدی بنتے ہی عورت کی تمام سماجی حیثیت ختم ہو کر محض کنیز یا لونڈی کی رہ جاتی اور اس کے مالک کو مکمل اختیار ہوتا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھے یا کسی اور کو بطور تحفہ دے دے۔اسی لئے جنگوں کے بعد فتح کی خوشخبری کے ساتھ یہ اطلاع خصوصاً بھیجی جاتی کہ کتنی عورتیں گرفتار کی گئی ہیں۔خوش شکل عورتیں حکمرانوں میں اور باقی عام سپاہیوں میں تقسیم کر دی جاتیں اور یہ دستور بھی تھا کہ عورتوں کو گرفتاری سے بچانے کیلئے قتل کر دیا جائے جیسا کہ راجپوتوں میں یہ رسم تھی کہ جب وہ شکست کے آثار دیکھتے تو عورت کی نہیں بلکہ خود اپنی عزت آبرو بچانے کیلئے عورتوں کو قتل کر دیتے یا زندہ جلا دیتے اور وہ مرد بہادر اور عظیم کہلاتے جنہوں نے اپنی آبرو بچانے کیلئے اپنی عورتوں کو اس طرح مار دیا یعنی جنگوں کے دوران سب سے

زیادہ اذیت کا شکار عورت ہی ہوا کرتی ہے۔ فاتح افواج سب سے پہلے محکوم افواج کی خواتین کی آبروریزی کرتیں اور یہ قدیم تاریخ کا تذکرہ نہیں دوسری جنگ عظیم میں روسیوں نے یا پھر چند سال پہلے سربیا کی فوجوں نے بوسنیا کی خواتین کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔

کبھی کبھی عورت تاریخ میں اس وقت بھی اہم بن کر ابھرتی ہے جب اسے مظلوم بنا کے جنگ کی جاتی ہے۔ اس طرح حکمران دراصل اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو پورا کرتے ہیں اس کی ایک مثال سندھ پر عربوں کا حملہ ہے۔ حملے کی جو وجہ بیان کی گئی اُس میں یہ کہانی ہمارے سامنے آتی ہے کہ جب سندھ کے ڈاکوؤں نے سری لنکا سے عرب جاتے کچھ عورتوں اور بچوں کو پکڑ لیا تو تب ایک لڑکی نے بصرہ کے گورنر حجاج بن یوسف سے فریاد کی تھی۔ اس واقع کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پھر تاریخ میں اس لڑکی کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا کیونکہ حملہ اور فتح کے بعد اس کی شاید ضرورت ہی نہیں رہی۔ تاریخ میں عورت کا تذکرہ جب بحیثیت ماں کے آتا ہے تو اس کی بڑائی یا عظمت بھی محض یہی ہوتی ہے کہ اس نے جیالے عظیم اور بہادر سپوتوں کو جنم دیا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ملک اور قوم اور تہذیب کے زوال کی بڑی وجہ بھی عورت ہوتی ہے جبکہ قوموں کے عروج کے تذکرے میں عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا زوال پذیر قوموں کی تمام ذمہ داری مورخ حکمرانوں پر اس تنقید کے ساتھ ڈالتے ہیں کہ انہیں شراب اور عورت نے تباہ کیا۔ 1902ء میں امن کا نوبل انعام لینے والے جرمن مورخ نے رومیوں کے زوال کی وجہ یہ بیان کی کہ جیسے جیسے ان کے معاشرے میں عورت کا سماجی رتبہ بڑھتا چلا گیا وہ معاشرہ زوال پذیر ہوتا گیا۔ اسی طرح انگلستان کا معروف مورخ اس بات کا قائل ہے کہ انسانی تاریخ کے دور میں تمام تباہیاں عورت کی وجہ سے ہیں اور خود

ہمارے ہاں بھی جھگڑے فساد کا بڑا سبب اب تک بے جان زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی قرار دیا جاتا ہے ہندوستان کے معاشرے میں عورت کا سماجی مرتبہ غالباً تب بالکل ختم ہوگیا جب رامائن سامنے آئی اور اس کی حیثیت کا اندازہ سیتا کے کردار سے لگایا جا سکتا ہے جو مکمل طور پر شوہر کی تابع ہے اور اس کے ساتھ جلاوطن بھی ہو جاتی ہے لیکن جب لنکا کا راجہ راون سیتا کو اغوا کر کے لے جاتا ہے اور جب وہ دوبارہ واپس آتی ہے تو شوہر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ سیتا آگ پر سے گزر کر اپنی پاک دامنی ثابت کرتی ہے لیکن شوہر کے دل میں خلش باقی رہتی ہے اور وہ سیتا کو پھر جلاوطن کر دیتا ہے۔ اس پر سیتا دعا کرتی ہے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ سیتا کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پاکبازی کو ثابت کرتے ہوئے خود کو قربان کر دیتی ہے۔ یہی سیتا آج تک ہندو معاشرے کا ایک رول ماڈل ہے اور پھر قرونِ وسطیٰ کے آتے آتے جب یہ احساس تقویت پانے لگا کہ شوہر کے بعد معاشرے میں عورت کے لئے کچھ نہیں رہتا تو پھر ''ستی'' نے معاشرے میں رسم کے طور پر جنم لیا۔ ''ستی'' کا مطلب پاک ہونا ہے یعنی جو عورت اپنے شوہر کی چتا پر جل جائے وہ پاکباز سمجھی جاتی ہے آخری دور تک ہندوؤں میں بیوہ کی شادی ہو جاتی تھی لیکن بدھسٹ دور تک ''ستی'' کی رسم پہلے طبقہ اعلیٰ میں پھیلی پھر دوسرے لوگ بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔

معروف سیاح ابن بطوطہ اپنے سفر نامے ''عجب اسفار'' میں ''ستی'' کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کرتا ہے کہ جب ایک بیوہ نے ''ستی'' کا ارادہ کیا تو تین دن پہلے گانے بجانے میں مشغول ہوگئی گویا دنیا سے رخصت ہونے کو تھی۔ چوتھے دن اس کا بناؤ سنگھار کر کے اسے خوشبوئیں لگا کے گھوڑے پہ سوار کیا گیا اس کے دائیں ہاتھ میں ایک ناریل تھا جسے وہ اچھالتی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس سے وہ خود کو دیکھے جاتی تھی۔ نقارے اور نوبت بجتے جاتے تھے۔ ہر ہندو برہمن جھک کر اسے کہتا کہ میرا سلام میرے مردہ ماں

باپ یا بھائی بہن تک پہنچا دینا اور وہ کہتی کہ اچھا اور ہنستی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ عورت ایک حوض کے پاس پہنچی وہاں اس نے غسل کے بعد ایک موٹی ساڑھی پہن لی اور نزدیک آگ بھڑکائی گئی اور اس پر سرسوں کا تیل چھڑک دیا گیا اور اس نے اسی حالت میں آگ میں چھلانگ لگائی۔ نقارے بجنے شروع ہو گئے اور اردگرد کھڑے لوگوں نے آگ پر لکڑیاں، ڈالنی شروع کر دیں اور اس کے اوپر بڑے بڑے کنڈے پھینک دیئے گئے تا کہ عورت آگ کے اندر حرکت نہ کر سکے۔ ابن بطوطہ یہ منظر دیکھنے کے بعد بے ہوش ہو گیا۔

22 جولائی 2004ء

عورت ''کاروکاری'' اور ''سوارہ''

تاریخ کے پرانے اوراق کو پلٹتے جائیں تو بلوچستان میں میر چاکر اعظم کے بادشاہت چھوڑ کر فقیری اختیار کر کے پنجاب کو نکل جانے کے بعد جب بلوچ قبائل کی ایک بڑی تعداد سرحد میں آ کر آباد ہو گئی تو اس وقت سے ہی ہمیں اس رسم کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو آج کاروکاری کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ کارو کا مطلب ہے'' کالا یا سیاہ مرد'' اور کاری کا مطلب'' کالی سیاہ عورت''۔ یہ خطاب ہر اس مرد یا عورت کو دیا جاتا ہے جو اپنی مرضی سے روائتی رسم ورواج کے خلاف شادی کر لیتے ہیں یا کوئی اور تعلق رکھتے ہیں۔ 1873ء میں ڈیرہ غازی خان اور بلوچستان کے قبائل اور انگریز گورنر البرٹ سینڈی گن کے درمیان معاہدہ کے نتیجے میں جن لاتعداد قبائلی رسوم ورواج کو قانونی تحفظ دیا گیا تھا اس میں سے ایک ''کاروکاری'' بھی تھی جنوبی بلوچستان میں ایک مقدمے کی تفتیش کرنے والے تحصیلدار نے بتایا کہ ایک شخص کو دوسری شادی کی خواہش تھی لیکن اس کی پہلی بیوی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ چنانچہ بیوی سے چھٹکارہ پانے کیلئے اس نے ایک منصوبہ تیار کیا اور ایک نزدیکی فیکٹری میں کام کرنے والے اپنے ایک جان پہچان والے شخص کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ مہمان جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اس نے مہمان اور اپنی بیوی دونوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

تحصیلدار کے مطابق قاتل اس لئے بچ جاتے ہیں کہ واقعہ کی کوئی شہادت عموماً نہیں ہوتی اور یہ کام انتہائی اشتعال کی حالت میں ہوا ظاہر کیا جاتا ہے۔

ایک اور مقدمے میں ایک داماد اپنے سسر سے زمین کا تقاضہ کر رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا کہ اگر زمین اس کے نام نہ کی گئی تو وہ اس کی بیٹی یعنی اپنی بیوی کو ''کاری'' کر دیا کہ زمین اس کے نام نہ ہو سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قتل ہونے والوں کی اکثریت خواتین کی ہے اور کسی نے کارو ہونے والے اپنے بھائی یا بیٹے کو اب تک قتل نہیں کیا۔ کارو کاری کے مقدمات ہمیشہ 302 دفعہ کے تحت درج نہیں ہوتے اور کچھ قبائلی علاقوں میں جہاں پولیس کا عمل دخل نہیں قتل ہونے والی عورت کے لواحقین ڈپٹی کمشنر یا ناظمین سے گزارش کرتے ہیں کہ لاش ان کے حوالے کر دی جائے اور کیونکہ لاش کا پوسٹمارٹم وہاں نہیں ہوتا اس لئے قتل کے کیس کے آگے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس رسم کے خاتمہ کے معاملے پر قانون سازی کی بحث کے دوران کچھ روز پہلے قومی اسمبلی میں ہنگامہ آرائی ہوئی لیکن یہ رسم آخر ہے کیا؟

اندرون سندھ سے لالہ اسد پٹھان کی رپورٹ پڑھیں۔ ''سندھ کے ضلع گھوٹکی کے علاقے کھیجو جو سرحدی پٹی پر واقع ایک گوٹھ (گاؤں) ہے جس کے اردگرد سینکڑوں دیگر دیہات آباد ہیں ان تمام دیہاتوں کے درمیان ایک قبرستان واقع ہے جس کو کاریوں کا قبرستان کہتے ہیں مذکورہ قبرستان دو ڈھائی سو سال پرانا ہے اور اس میں سینکڑوں خواتین بغیر کفن اور نماز جنازہ کے دفن کی گئی ہیں۔ سندھ کے بیشتر علاقوں میں کاری ہونے والی عورتوں کو کفن یا دفن کرنا تو دور کی بات اس کی نماز جنازہ اس لئے نہیں پڑھائی جاتی کہ گوٹھ میں موجود دوسری عورتوں کو یہ پیغام مل سکے کہ یہ مرد کا بنایا ہوا معاشرہ ہے جس میں تم زندگی گزار رہی ہو اور اس قبرستان میں جو خواتین دفن ہیں ان کی عمریں تقریباً 18 سے 45 سال کے

درمیان ہیں۔ اس قبرستان میں جن قبیلوں کی خواتین دفن ہیں ان میں جتوئی، پنجابی، شیخاور، بگٹی وغیرہ ہیں۔ کاروکاری کی رسم کی وجہ سے اس علاقے میں جہالت ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو پڑھے لکھے ہیں مگر وہ بھی اپنے قبیلے کے رسم ورواج کے مطابق چلتے ہیں یعنی پڑھے لکھے جاہلوں میں شمار ہوتے ہیں اور یہاں کے باسی کاروکاری ہونے والے لوگوں کو برداشت نہیں کرتے اور کاروکاری کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جہالت بہت زیادہ ہے اور پڑھے لکھے لوگ جن قبیلوں میں ہیں وہ تو آپس میں مسئلہ حل کر لیتے ہیں لیکن جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں وہ اپنی عورت کو کسی غیر مرد سے بولتا بات چیت کرتا برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر عورت اس کی خلاف ورزی کرے گی تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور جس کی بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ جائے تو اس مرد کو 75000 روپے لڑکی والے دیتے ہیں جرمانے کے طور پر اگر وہ رقم ادا نہیں کریں گے تو اس کے تمام گھر والے کاروکاری کے زمرے میں آتے ہیں اور لڑکے والے جس کو چاہیں اس کو مار سکتے ہیں۔ چاہے اس کا باپ ہو، چچا ہو کوئی بھی ہو کسی کو بھی مار سکتے ہیں اور اس رسم کے ذریعے جو قتل کئے گئے ہیں ان میں خواتین کی تعداد 90 سے لے کر 100 تک ہے اور مرد 15 سے 20 ہوں گے۔ میری عمر اس وقت 35 سال ہے میں تو یہی چاہتا ہوں کہ اس رسم کو ختم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کی رسم ہے۔ ہم کس طرح اس کو ختم کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارا معاشرہ الگ ہے یہاں پر طلاقیں بھی ہوئیں مگر جو ہمارا رواج ہے ہم تو اسی پر چلنا چاہتے ہیں ہم اپنے آپ کو کیونکر بدلیں کیونکہ ہمارے سردار بھی اس رسم کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں ان کو جھٹلائیں وہ ہمارے مائی باپ ہیں یہاں کے چوہدری ہیں وہ جیسا کہیں گے۔ ہم کریں گے ان کے حکم کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے یہاں پر ایک سکول بھی ہے لیکن صرف عمارت کی حد تک۔ یہاں نہ کوئی استاد آتا ہے۔ اور نہ ہی آنے دیا جاتا ہے ہماری جتنی بھی نسلیں آئی یا آنے والی ہیں تعلیم کے بغیر ماشاء

اللہ بہت اچھے کام کر رہی ہیں۔ اپنے رسم رواج سے نہیں ہٹنا چاہیے۔ کیونکہ انہیں میں ہماری عزت ہے اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے بچوں اور بچیوں کو تعلیم دلا ہی دیں تا کہ کچھ نہ کچھ ہمارے معاشرے میں بھی تھوڑی سی تبدیلی آ جائے کیونکہ یہاں کے سردار بہت اچھے ہیں۔ ایک دو وقت کی روٹی دے دیتے ہیں بس ہم اس پر خوش ہیں کیونکہ ہم ان کی رعایا ہیں اور کاروکاری کا فیصلہ سردار کرتے ہیں اور جب یہ سزا دینی ہوتی ہے تو لکھ کر لگا دیتے ہیں کہ اس قبیلے کے اتنے روپے اس قبیلے نے دینے ہیں اگر رقم ادا نہ کرے تو مرنے کیلئے تیار ہو جائیں۔

23 جولائی 2004ء

''کاروکاری'' اور ''سوارہ''

دریائے سندھ کے آس پاس رہنے والے آبادی کے لوگ کاروکاری کو قتل کرنے کے بعد دریا میں بہادیتے ہیں اور عورت کی ناک کاٹ دیتے ہیں تاکہ دریا میں آگے چل کر کوئی اس نعش کو باہر نکالے تو وہ اس کی کٹی ہوئی ناک دیکھ کر سمجھ جائے کہ یہ ''کاری'' عورت ہے اور اس کی نعش دریا سے باہر نکال کر دفن نہیں کرنی اسی طرح دریائے سندھ سے دور آباد علاقوں کے لوگ ''کاری'' کو بغیر کفن اور نماز جنازہ کے بغیر گڑھے میں دفن کر دیتے ہیں۔ اور اس کی فاتحہ بھی نہیں پڑھی جاتی۔ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ شادی شدہ عورت قتل ہونے کے بعد اس کے والدین خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی کا نصیب ہی یہی ہے۔ ''کاری'' کے قتل ہونے کے بعد کاروقرار دیئے گئے شخص سے اچھی خاصی رقم لی جاتی ہے۔ اور کسی کاری کی قبر بھی پکی کرادی جاتی ہے۔

☆☆ سردار اکبر بگٹی سے بات چیت۔ کاروکاری کوئی انوکھی چیز نہیں ہے یہ ہمارے لئے اچھے رسم ورواج ہیں ہم اس سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ رسمیں قائم ودائم رہیں اور کچھ رسموں میں ہم نے ترامیم کی ہیں۔ ان رسموں سے تمام قبیلوں کی عزت برقرار رہتی ہے اور تمام قبیلے ملکر اس رسم کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ کوئی نہیں

چاہے گا کہ میری عزت ختم ہو جائے کہ ہمارے خاندان یا برادری کی کوئی خاتون گھر سے بھاگ کر کسی اور قبیلے میں چلی جائے ہمیں اپنی عزت کی طرف دیکھنا ہے جس چیز میں ہماری عزت ہوگی اسے ہم ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ یہاں عورت کو پتا ہے کہ کاروکاری کی سزا کیا ہے وہ خود اپنے آپ کو پھانسی کے پھندے پر لٹکاتی ہے یہ بھی ایک باعزت طریقہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ختم کر لیتی ہے۔ بجائے خاوند اس کو مارے یا بھائی اس کو مارے اور ہمارے لوگ عاشق کا پیچھا کر کے مار دیتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی کا ہمارے رسم ورواج کا بنیادی جزو ہے۔ اس لئے کوئی بھی نہیں چاہے گا کہ سارے لوگ سارا قبیلہ بے غیرت بن جائیں۔۔

DPO سکھر غلام شبیر شاہ کہتے ہیں کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہم تو سیدھا سیدھا قتل کا کیس دائر کرتے ہیں جو کہ 302 ہے، کیونکہ یہ ہے ہی قتل۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے ٹیکس وصول کرتا ہے لیکن آگے چل کر عدالت یا کورٹ میں کیس چلتا ہے تو جس قانون کے مطابق کیس چلتا ہے وہ قانون انگریز کا بنایا ہوا ہے جس سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قبیلے والے لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا یا کوئی بھی مرد جذبات میں آ گیا تھا اس لئے اس نے یہ کام کیا کیونکہ اس نے اپنی عورت اور دوسرے مرد کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا جس کی وجہ سے وہ رہ نہ سکا اس نے یہ کام کر دیا۔

اور دوسری طرف صوبہ سرحد کے قبائل میں بھی ایک ایسی ہی رسم پائی جاتی ہے جسے حرفِ عام میں ''سوارہ'' کہا جاتا ہے۔ پشتو زبان میں اس لفظ کا مطلب ہے ''ایک ایسی عورت جو گھوڑے، اونٹ یا کسی اور سواری پر سفر کرتی ہو۔'' پہلے زمانے میں جب کوئی اور سواری کا ذریعہ نہیں ہوا کرتا تھا تو لوگ جانوروں کو ہی اس مقصد کیلئے استعمال کیا کرتے تھے۔ آج اس رسم کے تحت عورتوں اور کم عمر بچیوں کو کسی گھوڑے یا اونٹ پر ہی سوار کروا کر روانہ کیا جاتا ہے۔ اس رسم کو ''سوارہ'' کہا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ مقبول طریقہ یہ رائج ہے

کہ ایک کم عمر لڑکی کو اپنے باپ ، بھائی یا چچا کے قتل کے جرم میں مرتکب ہونے کے بعد بطور جرمانہ مقتول کے ورثا میں سے کسی مرد کے حوالے کر دیا جاتا ہے یہ اقدام اس نظریے کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ ایک لڑکی کو دشمنوں کے حوالے کر کے علاقے میں اس دشمنی کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کئی مزید انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

اس قسم کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کیلئے جرگہ تشکیل دیا جاتا ہے اس میں دونوں طرف کے معمر اور باعزت فرد سامنے آتے ہیں اور وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ قتل کے بدلے میں نقد رقم یا پھر زمین کا ٹکڑا، جانور، بندوقیں یا پھر ایک یا دو بچیاں مجرم کے خاندان سے مقتول کے لواحقین کو دے دی جاتی ہیں۔ پیش کی جانے والی لڑکی ''سوارہ'' کہلاتی ہے اگر لڑکی بالغ ہے تو اسے فوراً ہی مخالف کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ امانت کے طور پر کچھ عرصے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ مخالف کے حوالے کیئے جانے کے بعد اس بات کا مکمل انحصار لڑکی کو حاصل کرنے والے مرد پر ہوتا ہے کہ وہ اس لڑکی سے نکاح کرتا ہے یا نہیں۔ عموماً اس لڑکی سے کبھی نکاح نہیں کیا جاتا اور اس طرح مجرم کے خاندان کو علاقے میں مزید ذلت کا نشانہ بنائے رکھا جاتا ہے۔ ''سوارہ'' ہونے والی لڑکی اپنی قسمت کا فیصلہ جرگے سے حاصل کرتی ہے۔ کئی ایسے مقدمات جو عدالتوں میں تصفیہ پا جاتے ہیں ان کی وجہ بھی عدالت کے باہر خاندانوں کا ''سوارہ'' پر متفق ہو جانا ہے۔ اگر اس تصفیہ کا مجرم کی پھانسی کے اعلان کے بعد کیا جائے تو ''سوارہ'' ہونے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور اس واقعہ میں ایک شخص کی جان بچانے کیلئے 24 سال کی ایک لڑکی سے لے کر 14 ماہ کی ایک بچی تک ''سوارہ'' کی گئیں۔ دشمن کے گھر پہنچنے کے بعد ''سوارہ'' ہونے والی لڑکی تمام زندگی وہاں ذلت اور حقارت کا نشانہ بنتی ہے اور اکثر حالات میں اسے گھر کی خدمت گزاری پر لگایا جاتا ہے۔ یہ بچی اس گناہ کی تمام عمر سزا بھگتتی ہے جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوا لیکن اس کی اس

قربانی کا مقصد صرف کسی اور گناہ گار کی زندگی اور اپنے خاندان کی عزت بچانا ہوتا ہے۔ ''سوارہ'' ہونے والی کئی بچیوں کی چند ہی روز بعد خودکشی کی داستانیں قبائلی علاقوں میں عام ملتی ہیں۔ یہ رسمیں ہندوانہ اور جہالت کی پیداوار ہیں ہمارے پیارے ملک میں یہ رسمیں آخر کب تک چلتی رہیں گی۔ کب تک ہم جہالت کے اندھیروں میں پھنسے رہیں گے؟ آپ سب سے میرا یہی سوال ہے؟

24جولائی2004ء

ہمارا تعلیمی نصاب اور تاریخ

جو نصاب ہم طلباء کو ہم پڑھاتے ہیں وہ متنازعہ ہے غلط ہے اور اس سلسلے میں ایک این جی او کی طرف سے پہلی سے 12 ویں جماعت کے نصاب پر ایک متنازعہ رپورٹ منظرِ عام پر آئی ہے جس پر نظر ثانی اور اس کے جائزے اور تجزیے کیلئے وزارت تعلیم نے ایک کمیٹی بھی قائم کر دی۔ اس وقت تاثر مضبوط کیا جا رہا ہے کہ پاکستانی سکولوں کا نصاب اور درسی کتب جہاد کی تعلیم کے ذریعے دہشت گرد پیدا کر رہے ہیں۔ دنیا کی محبوب قوموں یعنی اسرائیل، بھارت یا انگلستان پر وہ کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا گیا ہے جس سے عالمی امن کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ اسلامیات کی تدریس کے ذریعے اقلیتوں کے حقوق مارے جا رہے ہیں۔

اسی دوران ایک اخباری اطلاع کے مطابق اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں نصاب تعلیم سے جہاد، مینار پاکستان 1971ء یا 1965ء کی جنگوں کے شہداء کے تذکرے، بھارت سے ممکنہ نفرت پیدا کرنے والے تمام مضامین، اثاثوں کی تقسیم، مسلمانوں کے قتل عام سمیت پاکستان سے متعلق یا متعدد موضوعات کو ختم کرنے کی سفارش کی ہے اور اسی دوران نصاب سے منسلک تمام تعلیمی اداروں کو فاؤنڈیشن سے منسلک کرنے کا بھی اعلان کیا ہے جس سے ملک کے بہت سے حلقوں میں بے چینی پھیل گئی ہے۔

انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام الفاظ اس دانشور اور روشن خیال طبقے نے اٹھائے ہیں جو ایک دور میں ہمیشہ ماسکو کو ہر قسم کی روشن خیالی کا منبع قرار دیتا رہا ہے اور آج وہی آزاد خیال لبرل طبقہ امریکہ کو اس لبرل ازم کا نمونہ قرار دیتا ہے لیکن ان میں سے شاید کوئی بھی شخص کوئی بھی دانشور خود امریکی نصاب تعلیم پر بحث کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ خود امریکہ کی نصابی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو سب سے زیادہ چیز جو متاثر کرتی ہے وہ پرانی اور نئی دنیا کا فرق ہے۔ وہ اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پرانی دنیا زوال پذیر فرسودہ اور گناہوں سے آلودہ ہو چکی تھی جبکہ نئی دنیا پاک وصاف شفاف اور نئی امیدوں کے ساتھ ابھری ہے۔ چنانچہ امریکہ کے سکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ امریکہ امیدوں اور توقعات کی سرزمین ہے اور خوابوں کی وہ تعبیر ہے جسے دنیا ایک عرصے سے دیکھ رہی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں بادشاہت نہیں تھی، امراء کا اقتدار نہیں تھا اور یہاں افراد کا تاریخی کردار ہے جنہوں نے اپنی محنت اور مشقت سے اپنی دنیا تعمیر کی چنانچہ یہ تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے مختلف ہے اور اسی طرح حب الوطنی اور قوم پرستی کے وہ گہرے جذبات پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے کہ امریکی خود کو باقی اقوام سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ جب بھی کسی شخص کو ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے تو سب سے پہلے اسے عام لوگوں سے مختلف ثابت کیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہیرو میں انسانی کمزوریاں نہیں ہوتیں مثلاً مشہور نابینا خاتون ہیلن کیلر کا جب ذکر ہوتا ہے وہ اس طرح کہ وہ ایک اندھی بہری اور گونگی خاتون تھیں جنہوں نے جسمانی نقائص کے باوجود تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں بھرپور مقام حاصل کیا۔ ہیلن کیلر کی زندگی کے اس حصے کو مکمل طور پر چھپا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک مکمل انقلابی سوشلسٹ تھی جو 1909ء میں سوشلسٹ پارٹی سے منسلک ہو چکی تھی چنانچہ اس نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ جسمانی نقائص کی اہم ترین وجہ

غربت اور غذا کی کمی ہوتی ہے اور ان بیماریوں کی وجوہات معاشرے کے طبقاتی نظام میں موجود ہیں۔ ہیلن کیلر کو اس کے دور کے مشہور اخبارات نے غدار قرار دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا کہ اپاہج عورت جو خود اس قابل نہیں کہ اپنے نظریات تشکیل دے سکے کس طرح اقوام کو کوئی نظریہ دے سکتی ہے۔ اسی طرح امریکی نصاب میں کولمبس کا تذکرہ بطور ایک ہیرو کے آتا ہے جس نے اس نئے براعظم کو دریافت کیا۔ لیکن اس نے یہ سفر کیوں کیا تھا اس کی وضاحت پیش نہیں کی جاتی۔ کولمبس کہتا تھا کہ سونے سے بہتر اور قیمتی کوئی دوسری شے نہیں۔ جس کے پاس سونا ہو وہ اس کے ذریعے اپنی روح کو جنت میں بھی لے جا سکتا ہے۔ کولمبس کا مقصد سونے کی تلاش تھی۔ اس نے دولت حاصل کرنے کیلئے بڑے جتن کئے لیکن اس کی موت غربت اور گمنامی میں ہوئی۔ امریکی نصابی کتابوں کے برخلاف کہ وہ امیرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی گزارتا رہا۔ ایسا نہیں ہوا۔ امریکہ کی دریافت اور وہاں یورپین کے آنے کے بعد کیا ہوا؟ یہ جگہ یورپین کیلئے تو باعث رحمت ہے کہ وہاں ان کی زائد آبادی بس گئی، انہیں وہ ذرائع مل گئے جو استعمال کر کے انہوں نے معاشی طور پر ترقی کی لیکن خود امریکہ کے اصل باشندوں کے ساتھ کیا ہوا اس کی جھلک مشہور مورخ بلو کی کتاب 1492ء میں یوں نظر آتی ہے کہ مقامی لوگوں کو جمع کر کے ہسپانوی زبان میں فرمان سنایا جاتا تھا کہ تم سب لوگ چرچ کو کورٹ کے نام پر تسلیم کر لو اور بادشاہ کو اس سرزمین کا حکمران جان کر اس کے ساتھ وفاداری کرو ورنہ تمہاری عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے گا۔ موت اور زخم تم جس سے بھی دوچار ہو گے وہ سب تمہاری ہی خطا ہو گی۔ اس طرح ہتھیاروں اور گھوڑوں کی برتری میں آنے والے لوگوں کو فاتح بنا دیا گیا۔ 1493ء عیسوی میں مقامی آبادی کے ہر ایک قبیلے کو کچلنے کیلئے کولمبس نے دو سو سپاہی بیس گھڑ سوار اور بیس شکاری کتے بھیجے جنہیں مقامی لوگوں کو نوچنے کیلئے ان پر چھوڑ دیا گیا۔ امریکی نصابی کتابوں میں یہ سب کچھ موجود نہیں ہے کہ

وہاں کے مقامی باشندے کس طرح قتلِ عام کا شکار ہوئے اور ان کتابوں میں کولمبس صرف ایک ہیرو ہے جس نے بہادری، ہمت اور حوصلے کے ساتھ ایک نئی دنیا دریافت کی تھی۔ ایک اور نصابی کتاب جس کا عنوان امریکی روایات ہے اس میں لکھا ہے کہ 1620 عیسوی میں زائرین نے بندرگاہ پر اور اس کے اردگرد اپنی آبادی قائم کر لی تھی۔ بدقسمتی سے وہ دسمبر کے مہینے میں یہاں آئے تھے۔ وہ یہاں کی سردی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے چنانچہ مقامی انڈین نے دوستانہ طور پر ان کی مدد کی انہیں کھانے کی اشیاء دیں اور یہ بتایا کہ اناج کیسے کاشت کریں۔ جب گرمی کا موسم آیا تو آنے والے آبادکاروں نے کاشت کاری کی اور جب ان کی پہلی فصل کٹی تو انہوں نے اس خوشی میں انڈین دوستوں کے ہمراہ جوجشن منایا وہیں سے ایک تہوار نے امریکہ میں جنم لیا لیکن نصابی کتب میں یہ درج نہیں ہے کہ جب یہ واقعہ ہوا تو 96 فیصد مقامی آبادی یورپی آبادکاروں کے ہمراہ آنے والی بیماریوں بشمول طاعون اور خسرے سے مر گئی تھی۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے تھے اور ایک انگریز آبادکار نے اس دور میں اپنے دوست کو لندن میں خط لکھا کہ مقامی لوگوں کے علاقوں میں خسرے کی بیماری ان کا تعاقب کر رہی ہے اور خدا کی مہربانی سے ان کی اکثریت موت کا شکار ہو رہی ہے اور ہم ان کی خالی زمینوں کے مالک بن گئے ہیں۔ چنانچہ امریکی نصابی کتابوں میں جہاں مقامی باشندوں یا ریڈ انڈینز کا ذکر بہت کم ہے وہاں انہیں تہذیب کے افتتاحی دور کے معاشرے کا باشندہ قرار دے کر یہ تعصب دیا جاتا ہے کہ یورپی تہذیب و تمدن سے دور تھے۔ اس فرق کے باعث یہ جواز بنا دیا جاتا ہے کہ تہذیب یافتہ قوم کا غیر مہذب قوموں پر حکومت کرنا جائز ہوتا ہے۔ مکابر کو تہس نہس کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ انہیں غیر انسانی قرار دے دیا جائے چنانچہ ریڈ انڈین کو غیر مہذب غیر متمدن اور وحشی قرار دیتے ہوئے امریکی نصاب کی کتابوں میں انسانیت سے دور رکھا جاتا ہے جیسا کہ جنرل فلپ

شیری ڈین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ریڈ انڈین ایک مردار کی طرح ہوتا ہے۔ 1813ء تک امریکی لفظ کی اصطلاح مقامی انڈین کے لئے استعمال ہوتی ہے لیکن اس کے بعد یہ لفظ یورپی آبادکاروں کے لئے استعمال ہونے لگا امریکہ کا ایک مشہور مورخ لکھتا ہے کہ ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہٹلر کو ہمارے سکول کے طالب علموں سے زیادہ معلوم تھا کہ ہم نے مقامی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ہم نے ریڈ انڈین کے لئے وہ کیمپس بنائے تھے اور ہٹلر نے ان اقدامات کی تعریف کی ہے جو ہم نے مقامی لوگوں کے خاتمے کے لئے اختیار کئے تھے۔ مثلاً پابندیاں لگا کر انہیں بھوک سے مارنا اور ان کے خلاف جنگ کرنا وغیرہ ۔امریکی نصاب کی کتابوں میں وہاں غلاموں کی موجودگی اور ان کی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ابراہم لنکن کی وہ تقریر جس میں اس نے ساؤتھ ابنائی کی ریاست میں یہ کہا تھا کہ میں قطعاً اس بات کی حمایت نہیں کروں گا کہ سماجی یا سیاسی طور پر کالوں کو برابر نصاب دیا جائے۔ یا کسی کالے کو ووٹ کا حق دیا جائے یا سرکاری طور پر اس کو کوئی عہدہ دیا جائے وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ سیاسی سرپرستی میں ایسے گروپ یا جماعتیں امریکی تاریخ میں منظم ہوتے رہے جو سیاہ فاموں کے گھر جلاتے رہے اور سرِ عام انہیں پھانسی چڑھاتے رہے۔ اور ان لوگوں کے عوامی مقامات پر آنے پر طویل عرصے تک پابندی رہی اور یہ سب کچھ آج امریکی سکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب سے غائب ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں ریاست اور معاشرے کے نسلی اور مذہبی گروہوں میں ہمیشہ نصاب تعلیم کے معاملے پر تصادم رہا ہے اور شاید بہت کچھ ایسا بھی کتابوں میں موجود ہے جو کہ حقیقت سے دور ہے لیکن خود مختار قومیں اپنے مسائل خود طے کرتی ہیں۔ ہم دوسری قوم کے تجربات سے سبق تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن کسی بیرونی ملک یا ادارے کو قطعی طور پر مداخلت کی کھلی چھٹی نہیں دے سکتے۔ کیا لبرل ازم کے نام پر راجہ داہر کو ایک قوم پرست بنا کر لکھا جا سکتا ہے جو بیرونی

حملہ آوروں محمد بن قاسم وغیرہ کے خلاف اپنی دھرتی کا دفاع کررہا ہو۔ کیا قائداعظم کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ، گاندھی کے خلاف تعصب قرار پائے گا۔ کیا سکول کے بچوں کو علامہ اقبال یا قائداعظم یا دوسری شخصیات کے ذاتی زندگی کے واقعات بتانا لبرل ازم ہے۔ کیا 1965ء کی جنگ میں کس کی فتح ہوئی اور کس کی شکست اس پر نصاب کی کتابوں میں بحث ہو چکی ہے اور پھر یہ کہ جہاد اور شہادت کو کس طرح بچوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ چند اہم اور حساس موضوعات ہیں جبکہ اس وقت پوری قوم کو اور خاص طور پر ان لوگوں کو جو کہ بچوں کے نصاب پر کام کر رہے ہیں شدید مشکلات درپیش ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں ان کے ذہنوں میں کیا ڈال رہے ہیں اور جو کچھ ڈال رہے ہیں کیا وہ سب کچھ درست ہے، کیا وہ ہمارے مفادات میں ہے یا نہیں ہے۔

25 مارچ 2004ء

ہماری نصابی کتب اور تاریخ

ہمارے سکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب میں ایسا کیا غلط ہے جسے تبدیل کیا جانا ضروری ہے اور اس کے مضمرات کیا ہوتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ادارے اور روایات حالات و ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور وقت کے تقاضوں کے تحت یہ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے تاریخ ان لوگوں کے لئے ایک خطرناک چیلنج بن جاتی ہے جو کہ صاحب اقتدار ہوتے ہیں اور مستحکم اداروں کے ذریعے اپنی مراعات اور پوزیشنوں کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہر حکمران ہمیشہ تاریخ کو نظریات کے ایسے فریم ورک میں رکھتا ہے جہاں انہیں چیلنج کیا جا سکے اور ایک ایسے ماضی کی تشکیل چاہتا ہے جو کہ اس کے حق میں ہو۔ یہ بات طے ہے کہ تاریخ کو جب بھی کسی نظریاتی ڈھانچے میں لکھا جاتا ہے، واقعات کی جوڑ توڑ اور تاریخ کی غلط تعبیر و تفصیل لازمی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہندتو انظریے کا بانی پی ڈی سروا کر جو کہ 1966ء میں فوت ہوا لکھتا ہے کہ ایک ہندو وہ ہے جو کہ بھارت ورش کی سرزمین کو جو کہ دریائے سندھ

سے لے کر مشرق تک پھیلی ہوئی ہے اپنا وطن سمجھے۔ ساتھ ہی ہندو ہونے کے لئے یہ سرزمین مقدس بھی ہونی چاہئے اس کے لئے جس میں اس کی مذہبی پرورش بھی ہو اور اسے پروان چڑھائے۔ چنانچہ ہندتوا نظریہ کے مطابق ہندو صرف وہ ہوا جس کے لئے ہندوستان وطنی بھومی یعنی آباؤ اجداد کی سرزمین ہو۔ اس نظریے کے مطابق مسلمان اور عیسائی سرزمین ہندوستان سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور یہ ہندوستان سے وفادار نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی مقدس سرزمین ہندوستان کی سرحدوں سے باہر ہے۔ اس نظریے میں کمزوری اس وقت آئی جب یہ نقطہ اٹھایا گیا کہ ہندوؤں کی اکثریت کا تعلق جن آریاؤں سے تھا وہ بھی تو مقامی نہیں تھے اور ہجرت کر کے یا حملہ آور ہو کر یہاں آئے تھے تو ہندتوا نظریے کے مورخین نے یہ دلیل پیش کی کہ درحقیقت آریا بیرونی حملہ آور نہیں تھے بلکہ یہاں کے مقامی باشندے تھے جو یہاں سے ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آریاؤں کی تاریخ جس کا ذکر ہم اور وہ سنتے ہیں وہ انگریز نے 19 ویں صدی میں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے شروع کی تاکہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کو الگ الگ رکھ کر آریاؤں اور دراوڑوں میں اختلافات پیدا کئے جا سکیں۔ چنانچہ ہندتوا کے اس نظریے کے تحت اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمان ہندوستانی نہیں تو منطقی طور پر ان کے ادوارِ حکومت غیر ملکی تسلط بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ جو بھی ثقافتی یا مذہبی ورثہ وہاں چھوڑ آئے وہ ہندوستان کے لئے باعثِ فخر نہیں باعثِ شرم ہے چنانچہ یا تو انہیں مسمار کر دینا چاہئے جیسا کہ بابری مسجد کے ساتھ ہوا اور دوسری صورت یہ ہے کہ انہیں مندر بنا لیا جائے جیسا کہ تاج محل کے سلسلے میں بھی ایک طبقے کا یہ خیال ہے کہ یہ شاہ جہان کے دور سے بہت پہلے کا ایک مندر تھا۔

ہندوستان میں تاریخ اور نصابی کتب کے سلسلے میں کئی بار اس وقت کوشش کی گئی تھی جب جنتا دل کی حکومت آئی تھی۔ اس وقت پرکاش نارائن وزیر اعظم بنے تھے اور اس کے

بعد اب بی جے پی نے اپنے دورِ حکومت میں نصابِ تعلیم میں بڑی حد تک ہندتوا کے تحت بدلنے کی کوشش کی اور وہاں کے حکمرانوں کا موقف یہ ہے کہ اب تک کی تاریخ پر جو وہاں لکھی گئی اس پر دائیں بازوں کے مورخین کی اجارہ داری تھی جنہوں نے تاریخ نویسی کو اپنے کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ بی جے پی کے جوشی منوہر لال نے ان مورخین کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے نوجوانوں کے ذہنوں کے بگاڑ کا سبب قرار دیا۔ ہندوستان میں تاریخ کو دوبارہ لکھنے میں جو مسائل بحث کے باعث بنے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کیا قدیم ہندوستان کے لوگ گائے کا گوشت کھاتے تھے۔ لبرل مورخین کا کہنا ہے کہ ابتدائی دور میں آریا جو خانہ بدوش قبائل تھے مویشی پالتے تھے اور چراگاہوں کی تلاش میں جگہ جگہ گھوما کرتے تھے چنانچہ اس دور میں وہ گائے کا گوشت کھاتے تھے۔ لیکن بعد میں جب وہ زراعتی معاشرے میں تبدیل ہوئے تو گائے ان کے لئے اہم ہوگئی اور انہوں نے اس کا تحفظ شروع کر دیا چنانچہ ارتقائی تاریخی عمل میں مذہبی رسم و رواج یہاں پر جنم لیتے ہیں۔

بی جے پی کا موقف یہ ہے کہ نصاب کی کتابوں میں یہ بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کبھی ہندوستان کے باشندے گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ اس سے موجودہ دور کے لوگوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ پھر ہندوستان کی نصابی کتابوں میں ان تاریخی واقعات کا تذکرہ بھی اب بحث کا سبب ہے جو کہ مختلف گروہوں کے درمیان جذبات کے اشتعال کا باعث بن سکتے ہیں مثلاً سکھوں کے گرو دیو بہادر جنہیں پارسی ماخذوں میں لیٹرا اور ڈاکو کہا گیا ہے اور اس کی بنیاد پر اورنگزیب عالم گیر کے ہاتھوں اس کا قتل درست ہے۔ اس کے بارے میں سکھوں کی روایت ہے کہ ان کے قتل کے پیچھے ان کے اپنے خاندان کی سازش تھی جو انہیں گرو کے منصب پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح جاٹوں کا مسئلہ ہے جنہوں نے خاص طور پر 18 ویں صدی میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اب جاٹوں کو

وہاں ہرگز یہ بات قابل قبول نہیں کہ تاریخ میں یا کتابوں میں ان کے منفی کردار کو ابھارا جائے۔ چنانچہ یہ ہماری بھی نصابی کتابوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر کرشن کمار نے تحریک آزادی کے واقعات پر کافی بحث کی ہے اور یہ کہ کس طرح پاکستان اور ہندوستان کی نصاب کی کتابوں میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کرشن کمار اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ایک طالب علم کے لئے اس کا خاندان ہوتا ہے جہاں وہ بڑوں سے کہانیاں سنتا ہے۔ جس سے اس کے ذہن میں ماضی کا تصور بنتا ہے۔ کرشن کمار اس عمل کو خاموش علم کہتے ہیں۔ اس علم کے ذریعے بچے کو رسومات شخصیات اور ان کے کارناموں اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے جو کہ اس کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ تے ہیں۔ اس کے مقابلے میں پھر ایک سرکاری علم ہوتا ہے جو بچے کو نصابی کتب سے ملتا ہے۔ یہ علم سرکاری نقطہ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کی تخلیق کرتا ہے کہ طالب علم ریاست کا وفادار اور تابعدار شہری ہے۔ اکثر جب خاموش علم اور سرکاری علم کا تصادم ہوتا ہے تو طالب کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس سچائی کو تسلیم کرے تاہم انہیں سرکاری علم کے آگے ہتھیار ڈالنے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں امتحان پاس کرنا ہوتا ہے ڈگری لینی ہوتی ہے جو سوال پوچھا جائے ان کا جواب نصابی کتابوں کے مفہوم میں ہی دینا ضروری ہوتا ہے اس سلسلے میں قطعاً اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ کوئی یہ لکھ سکے کہ نصاب کے مواد سے اختلاف ہے یا وہ باہر کے آزاد ذرائع کے نقطہ نظر کو جواب میں شامل کر سکے۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کی نصابی کتب میں 1857ء کی جنگ آزادی، سرسید احمد خان اور ان کے سیاسی خیالات، 1905ء کی تقسیم بنگال اور قیام مسلم لیگ سمیت دیگر اہم نقاط پر متضاد نظریات ہیں۔ ہندوستان کی کتابوں میں یہ کہیں موجود نہیں کہ مسلمانوں کو آخر ایک علیحدہ قوم ہونے کا احساس کیوں پیدا ہوا اور پاکستان کی نصابی کتب

میں قوم پرست مسلمانوں کے بارے میں خاموشی ہے۔ کرشن کمار نئی دہلی میں لکھتے ہیں کہ بحیثیت استاد انہیں عجیب صورتحال کا سامنا کرنا پڑا مثلاً وہ جب اپنے طلباء کو یہ بتاتے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے تو طلباء ان سے پوچھتے کہ ہندوستان کو ایک ہندو ریاست کیوں نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جب طلباء کو بتایا جاتا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے جہاں پر ایک کلچر نہیں بلکہ کئی کلچرز ہیں تو ان کا سوال یہ ہوتا کہ پھر تقسیم کیونکر ہوئی۔

کیا ہم اپنی تاریخ اپنے نظریات کے مطابق بچوں کو بیان کرنے کا حق نہیں رکھتے اور کیا دنیا کے ہر ملک کی نصابی کتب اسی اصول کے تحت نہیں لکھی جاتیں۔ کیا تاریخ کو جھٹلایا جاسکتا ہے۔

26 مارچ 2004ء

مدرسوں کا نصاب تعلیم

ہم اپنے بچوں کو اپنے تعلیمی اداروں میں کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ کے مطالعے سے بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی مذہب پھیلتے ہیں اور زیادہ لوگ اس کے دائرے میں آنا شروع کرتے ہیں تو اس میں نئی پیچیدگیاں یوں پیدا ہوتی جاتی ہیں کہ آنے والے لوگ اپنے ساتھ مختلف روایتی قدریں، رسومات اور رواج بھی لے کر آتے ہیں اور بعد میں یہ دباؤ شروع ہو جاتا ہے کہ ان کی روایتی اقدار کو مذہب کے دائرے میں جائز اور صحیح تسلیم کیا جائے لہذا اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب کی تعلیمات کو بدلتے حالات کے تحت نئے معنی دینے کی کوشش ہوتی ہے اور ایسے علماء کی ضرورت پڑتی ہے جو بدلتی صورتحال میں مذہبی تعلیمات کی اصل روح برقرار رکھتے ہوئے اسے نئے انداز میں پیش کرسکیں۔ اس قسم کے علماء یا سکالرز کی ہر مذہب میں تعلیم و تربیت کے خاص ادارے میں ضرورت ہوتی ہے۔ عیسائیوں میں یہ ادارے مشنریز کہلاتے ہیں اور مسلم معاشرے میں انہیں مدرسہ کہتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مذہبی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ اساتذہ طلباء کو اپنے گھر پر بلاتے تھے یا پھر مسجد میں استاد اپنے مخصوص ستون کے گرد طلباء کو جمع کر کے درس دیا کرتے تھے۔ شروع میں یہ تعلیم قرآن اور حدیث پر مبنی ہوتی تھی لیکن بعد میں جیسے جیسے مسلمانوں کی حکومت

سیاسی طور پر وسیع ہونا شروع ہوئی اس کے ساتھ ہی سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل میں اضافہ ہونے لگا چنانچہ فقہ کے علم کی اہمیت بڑھتی چلی گئی اور حکومتوں کو انتظامی امور کیلئے نئے فقہاء اور قاضیوں کی ضرورت ہونے لگی جو مختلف امور کو شرعی روشنی میں دیکھ کر فتویٰ دے سکیں۔ تاکہ قاضی ان پر عمل درآمد کرواسکیں۔ لوگوں کے اخلاق اور کردار کی دیکھ بھال کیلئے محتسب کی ضرورت محسوس ہوئی جو جائز اور ناجائز کا فرق واضح کر کے لوگوں کو ان کا پابند کرائے۔ بڑی تعداد میں ایسے تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کیلئے جب اساتذہ کی رہائش گاہیں یا مسجدیں ناکافی ہونے لگیں تو خراساں میں 10 ویں اور 11 ویں صدی میں مدرسے کی بنیاد رکھی گئی تاکہ باقاعدہ نصاب کے تحت ماہر اساتذہ وہاں پر بچوں کو پڑھا سکیں۔ خراسان سے مدرسے کا یہ ادارہ پھیلا اور بہت جلد ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا کے ہر شہر ہر قصبے میں مدارس قائم ہونے لگے انہیں یا تو وقف کی رقوم چلاتیں یا پھر حکمران انہیں مالی امداد دیا کرتے تھے۔

جب اسلامی معاشرے میں فقہاء کے چار مکاتب یعنی حنفی، شافعی، حمبلی اور مالکی قائم ہوئے تو روایت یہ تھی کہ مدرسے میں یا تو چاروں مکاتب کی تعلیم دی جاتی یا پھر مدرسہ صرف ایک فقہی مکتب کی تعلیم و تربیت دیتا۔ جب مصر میں فاطمی خلافت قائم کی گئی تو جامعہ ازہر کا مدرسہ قائم کیا گیا تاکہ اسماعیلی عقائد کی تعلیم کے ذریعے دائیوں کی تربیت کی جائے اور پھر انہیں تبلیغ کیلئے اسلامی ملکوں میں بھیجا جائے۔ اس کے بعد مدرسے نے ایک نئی شکل اختیار کی کہ کسی ایک ہی فرقے کی تعلیم دی جائے۔ اس کے جواب میں سنجو کے وزیر نظام الملک نے سنجو کی سلطنت میں شافعی اور حنفی تعلیمات کیلئے ادارے کھولے۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرسے کے طور پر امام غزالی کا تقرر ہوا اور اس کے رد عمل میں حمبلیوں نے اپنے مدارس قائم کرنے شروع کردیئے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ فرقہ بندی شدید ہوتی گئی اور اس

تفرقے میں لوگ اور جماعتیں اس قدر ملوث ہوگئیں کہ اس سے ان کے خاندان اور قبائلی وفاداریاں بھی کمزور پڑ گئیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہی درست درس دیتے ہیں۔

ہندوستان میں اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں ملا نظام الدین نے مدرسہ کیلئے ایک نصاب ترتیب دیا جو کہ درس نظامیہ کہلاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت نے مفتی، قاضی اور محتسب وغیرہ کیلئے حنفی فقہ کے تحت علماء کی تربیت کی۔ یہ نصاب ہندوستان میں معیاری نصاب بن گیا اور تمام مدرسوں میں اسی کے تحت طلباء کو تعلیم دی جانے لگی۔ یہ نصاب تب تبدیل ہوا جب مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا اور ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی۔ اس مرحلے پر جب مدرسہ دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو 1866ء میں اس کے بانی علماء کو اس بات کا احساس ہوا کہ روایتی نصاب موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق نہیں رہا کیونکہ برطانوی انتظامیہ میں مفتی، قاضی اور محتسب کی ضرورت نہیں تھی۔ دیوبند نے نصاب میں زیادہ تر زور حدیث کی تعلیم پر دیا اور فقہ کی پہلے جیسی اہمیت نہیں رہی۔ دیوبند میں اہم ترین استاد شیخ الحدیث ہوا کرتے تھے۔ اس طرح پورے ہندوستان اور افغانستان میں مدارس کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ دوسرے فرقوں کے علماء خصوصاً بریلوی مکتبہ فکر کے لوگوں نے بھی اپنے مدارس قائم کیے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مدارس مکمل طور پر عموماً عوام کی جانب سے دیئے گئے عطیات سے چلتے تھے لیکن 70ء کی دہائی میں عرب ممالک نے بھی ان مدارس کی امداد شروع کی اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں ان کی اسناد کو دوسرے تعلیمی اداروں کے مساوی قرار دے دیا گیا۔

آج پاکستان کے طول وعرض میں 25 ہزار کے لگ بھگ مدارس ہیں جہاں سولہ لاکھ کے قریب بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان مدارس پر آج ایک بڑا الزام مغربی میڈیا یہ لگاتا ہے کہ ان میں جہادی پیدا کیے جاتے ہیں اور کم عمر بچوں کی برین واشنگ کر کے انہیں

بندوق تھما کے دوسرے فرقے یا مذہب کے پیروکاروں کو مارنے کا حکم اور اس کے بدلے جنت کی بشارت سنائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کی تحریک میں شہید ہونے والے اکثر نام مثلاً غلام عباس ، عارف حسین ،عثمان عتیق ،محمد صابر ، ابو عاصم ،فیصل محمود ،صداقت ، نذیر نیاز ، مدثر ، راشد ، یا تو یہ سب نوجوان کرسچن مشنری سکولوں مثلاً اِٹچیسن لاہور ، سینٹ پٹیر کراچی سے فارغ التحصیل تھے یا پھر دیگر سرکاری سکولوں ، کالجوں سے پڑھ کر نکلے تھے۔ ان مدارس پر ایک اور الزام یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ اساتذہ کے انتہائی غیر لچک دار رویے کے باعث یہاں تعلیم حاصل کرنے والے بچے پُرتشدد کردار کے حامل ہو جاتے ہیں وہ صرف اور صرف اپنے نقطہ نظر کو ہی شرعی تصور کرتے ہیں اور اس سے اختلاف رائے رکھنے والے کو مذہب سے باہر سمجھتے ہیں۔ ایک الزام ان مدرسوں پر یہ بھی لگتا ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد چونکہ ان بچوں نے یا ان نوجوانوں نے مسجدوں میں ہی امام ، واعظ اور خطیب بننا ہوتا ہے یا پھر نکاح ، طلاق و جنازے سمیت دیگر رسومات ہی اپنی کمیونٹی میں ادا کرنی ہوتی ہیں چنانچہ انہیں جدید سائنسی علوم کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اسے حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان مدارس کے طلباء پر بھی الزام ہے ان میں زیادہ تر غریب طبقے سے ہوتے ہیں جو کہ معاشرے میں تمام مراعات اور سہولتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ ان دینی مدارس کے بارے میں اس وقت پورا مغربی میڈیا بہت کچھ کر رہا ہے اور بہت کچھ لکھ رہا ہے اس وقت مختلف ممالک کو بشمول پاکستان بڑی تعداد میں امریکن امداد بھی دی جا رہی ہے تا کہ وہ ان مدارس کے سلسلے کو امریکی نقطہ نظر کے مطابق درست کر سکیں۔ •

27 مارچ 2004ء

تعلیمی نصاب میں تبدیلی کیوں؟

پاکستان میں پانچ اور نو سال کی درمیانی عمر سے تعلق رکھنے والے ایک کروڑ 80 لاکھ بچے رہتے ہیں ان بچوں میں سے ایک کروڑ 11 لاکھ کسی نہ کسی مرحلے پر کسی سکول میں داخلہ لے لیتے ہیں لیکن صرف 60 لاکھ بچے پانچویں کلاس سے آگے تعلیم حاصل کر پاتے ہیں۔

ہمارے ملک کی آبادی 2.6 فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے چنانچہ تعلیم سے محروم ان بچوں کی تعداد بھی اسی تناسب سے آگے جارہی ہے وطن عزیز میں آج ایک لاکھ 84 ہزار پرائمری سکولز ہیں اور ان میں سے ایک لاکھ 21 ہزار سرکاری سکولز ہیں۔ 25 ہزار دینی مدارس ہیں اور 38 ہزار پرائیویٹ سکولز ہیں۔ وہ بچے جو اپنے بچپن میں کسی سکول میں داخل ہوتے ہیں انکی 70 فیصد تعداد سرکاری سکولز تک پہنچتی ہے۔ تاہم 5 اور 9 سال کی درمیانی عمر کے بچے اوسطاً صرف تین سال 8 مہینے جبکہ اس عمر کی بچیاں صرف ایک سال تین ماہ تک سکول جاری رکھ پاتی ہیں۔ یہ بچے اس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں پچھلے ساڑھے چار سالوں میں 80 لاکھ مزید افراد غریب لوگوں کی صف میں شامل ہوئے ہیں یہ لفظ غریب یا غربت بھی عجیب ہے اور یہاں یہ ضروری ہے کہ ہم خود سمجھ لیں کہ ہمارے ہاں غریب کون ہوتا ہے غربت سے کیا مراد ہے۔

حکومت پاکستان کے پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن کے 16 اگست 2002ء کے جاری کردہ خط کے مطابق 673.54 ماہانہ ہمارے لئے خطِ غربت ہے یعنی ہر وہ شخص جو اس سے زیادہ یعنی 673.54 ماہانہ کماتا ہے وہ غریب نہیں ہے۔

دنیا کے بہت سے مالیاتی اداروں نے 2 ڈالر یومیہ سے کم کمانے والے کو ہمارے ہاں غریب قرار نہیں دیا بلکہ ہمارے لئے یہ تعریف 673.54 ماہانہ رکھی گئی ہے اور آپ اندازہ لگائیں کہ اگر اسی تعریف کو معیار سمجھ لیا جائے تو ہمارے ملک کا ہر دوسرا شخص آج غریب ہے۔ اور اس آمدنی کے ساتھ اپنے بچے کو سکول بھیجنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس بچے کے لئے آج دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے عظیم ادارے ایک ایسا جدید نصابِ تعلیم تیار کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور پریشان ہیں جو اس بچے کو مہذب دنیا میں زندگی گزارنے کے اصول بتا سکے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس ملک کا ایک خاص طبقہ تو وہم میں مبتلا ہو چکا ہے لیکن یہاں کا ایک عام شخص اب بھی اپنے مذہبی اور قومی نظریات پر جان دینے کو تیار ہے۔ تو پھر مغربی اخبارات خصوصاً انگلش پریس کی ایک مخصوص لابی نے درسی کتب اور ٹیکسٹ بک بورڈز کے خلاف ایسا پروپگنڈہ شروع کیا کہ اس کے بعد بیرونی سفارت خانوں کے مہمانوں کی فہرستوں میں موجود پسندیدہ ماڈریٹس ادارے اور کچھ مخصوص شخصیات اچانک بیدار ہو گئیں۔ یہ وہی طبقہ ہے جو سیکولر تعلیمی اداروں سے وابستہ ہو کر غیر ملکی نصاب پڑھانے کا دعویٰ کر کے اربوں روپیہ سالانہ کمانے کے علاوہ زیادہ ماہر قرار پایا ہے یہ غیر ملکی سپانسرڈ دوروں کا بھی استحقاق رکھتا ہے۔ پھر دیدہ و نادیدہ اثر و رسوخ انہیں ہر دور میں حکمرانوں کے قریب لے آتا ہے اس میں مختلف غیر حکومتی تنظیمیں این جی اوز بھی شامل ہیں۔

ایک ایسا بھی گروپ 29 افراد پر مشتمل ہمارے سامنے آیا جس نے وہ بحث چھیڑی جہاں حالیہ دنوں میں نصاب کے معنی اور تاریخ یکسر نظر انداز کر کے فکر نصب العین،

تہذیب یا نظریہ روایت کو ترک کر کے قوم کی فکری پٹڑی پر اپنی سفارشات کا بم اس طرح رکھنے کی کوشش کی گئی کہ متعین وقت پر مطلوب دھماکے ہو سکیں۔ اس رپورٹ میں سکولوں میں پڑھائے جانے والے عمرانی علوم یعنی اردو، انگلش، مطالعہ پاکستان کے نصابات اور درسی کتب کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اس میں موجودہ رائج نصاب کے تحت پروان چڑھنے والی نسل جہاد اور شہادت کا درس لے کر جوان ہوگی تو ملک میں رواداری برداشت اور تحمل کی وہ فضا پیدا نہیں ہوسکتی جو ہندوستان سے دوستی کے لئے درکار ہے۔ اس رپورٹ کے تخلیق کاروں نے پاکستان کے نظریے اور مذہب پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور یہ بات بہت اہم ہے کہ بجائے اس کے کہ درسی کتب میں موجود زبان کو درست کرتے یا پھر دیگر مندرجات کو اپ ٹو ڈیٹ کرتے خصوصاً سائنسی اور فنی شعبہ جات کو بہتر بناتے، انہوں نے اس رپورٹ میں سائنسی اور فنی تعلیم کو چھیڑا ہی نہیں اور صرف مذہب اور معاشرتی علوم پر نظر رکھی۔ یاد دلاؤں کہ یہ رپورٹ انہوں نے دینی مدارس نہیں بلکہ عام سکولوں کیلئے تیار کی تھی۔ یہ رپورٹ میڈیا میں مجموعی طور پر شدید تنقید کا نشانہ بنی اور اس کے بعد وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے حکم جاری کیا کہ اقدار کے منافی کچھ بھی درسی کتب میں شامل نہیں ہوگا اس بیان کے ساتھ ہی مارکیٹ میں لاکھوں کی تعداد میں وہ کتابیں چھپ کر آ گئیں جن پر یقیناً کئی سالوں سے کام ہو رہا ہوگا اور ماڈریٹ ترقی پسند دانشور جن کتابوں کے ایک ایک لفظ، جملے، تحریر آیت یا حدیث کو مہذب دنیا کی عینک سے پڑھ چکے ہونگے۔ میڈیا نے تمام تو جہات تسلیم کرنے سے انکار کیا تو اسلام آباد کے ایوانوں میں بھی احتجاج شروع ہوا۔ حکمران جماعت اس وقت مسلم لیگ ہے جو نظریہ پاکستان کی محافظ ہونے کی دعویدار ہے چنانچہ چوہدری شجاعت حسین صاحب کے اس بیان کے بعد کہ اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کے حوالے سے شائع کی گئی متنازعہ کتابوں کی اصلاح کی بجائے انہیں نذرِ آتش کر دیا جائے خواہ اس مقصد کیلئے

کروڑوں روپے کا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے، پنجاب کے وزیراعلیٰ چوہدری پرویزالٰہی کی طرف سے نامناسب مواد کی حامل تمام درسی کتب کی تقسیم روک دینے کا حکم جاری ہوا ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کردی گئی ہے جس کی رپورٹ کے بعد غلطی کے مرتکب افراد کو سزا دی جائے گی۔ لیکن اسی دوران پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی چیئر پرسن نے ایک اجلاس میں وضاحت پیش کی کہ یہ سب کچھ مرکزی وزارت تعلیم کی منظوری کے بعد ہوا ہے جبکہ وفاقی وزیر تعلیم زبیدہ جلال نے ایبٹ آباد میں وضاحت فرمائی کہ وفاقی حکومت نے نصاب میں کسی قسم کی کوئی بھی تبدیلی نہیں کی اور جو کچھ بھی ہوا ہے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے خود کیا ہے۔ ابھی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ امریکن سینٹ کے 9/11 تحقیقاتی کمیشن کے سامنے صدر امریکہ کی قومی سلامتی کی مشیر کونڈ ولیزا رائس نے اپنے بیان کے دوران اچانک پاکستانی وزیر تعلیم زبیدہ جلال کو خراج تحسین پیش کر کے سب کو چونکا دیا۔ زبیدہ جلال کو اس سے پہلے امریکن سیکرٹری خارجہ کولن پاؤل، صدر بش کی اہلیہ لارا بش، اور نائب سیکرٹری دفاع بھی تعریفی کلمات سے نوازتے رہے ہیں اور یہ سب کچھ ایک ایسی قوم کے اعلیٰ ترین عہدیداروں نے کہا اور کیا جو کسی فری لنچ کے تصور پر یقین نہیں رکھتی۔

16 اپریل 2004ء

مولانا شاہ احمد نورانی کی یاد میں

آج کا پروگرام مولانا شاہ احمد نورانی کی یاد میں ہے۔

سیاست میں دلچسپی۔

54 کی تحریکِ ختم نبوت میں حصہ لیا۔ پہلا الیکشن۔ 1970ء میں کراچی سے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ سیاسی عہدہ۔ 1972ء میں جے یو پی کے سربراہ بنے جو آخر تک قائم رہا۔

تبلیغی سرگرمیاں

نوجوانی ہی سے یورپ اور افریقی ممالک کے دورے پر متعدد لوگوں کو مسلمان کیا۔ 1953ء اور 1964ء ورلڈ مسلم آرگنائزیشن کے جنرل سیکرٹری رہے۔

عالمی اداروں کی تشکیل

مکہ مکرمہ دارالرقم میں ورلڈ اسلامی مشن کی داغ بیل ڈالی۔ 1974ء میں صدر مقرر ہوئے۔ اسلامی مشن کو یورپ اور امریکہ میں منظم کرنے کا فریضہ انجام دیا۔

اپوزیشن تحریکوں میں شمولیت

1970ء کی قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی طرف سے فعال کردار، قادیانیوں کے خلاف مدلل تقاریر، سخت تنقید کے باعث سارجنٹ ایٹ آرمز کے ذریعے اسمبلی سے پھنکوانے کی کوشش بھی ہوئی۔ 1977ء میں پی این اے تحریک کے جلسوں میں شرکت پر قیدو

بند کی صعوبتیں سہیں۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کی مخالفت کی۔ ایم آر ڈی میں شمولیت کی کوشش میں عبدالستار نیازی کی مخالفت کے باعث باضابطہ شامل نہ ہو سکے۔

انتخابی شکستیں

1990ء کراچی ڈاکٹر فاروق ستار کے ہاتھوں شکست 1993ء میں علی پور، مظفر گڑھ سے عبدالقیوم جتوئی کے ہاتھوں ناکامی۔ چھ دینی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ غیر متنازعہ ہونے کے باعث اتحاد کی صدارت کا عہدہ دیا گیا جو مدت ختم ہونے کے باوجود واپس نہیں لیا گیا۔ 2003ء میں سینٹ کے انتخابات میں کامیابی۔ وفات 11 دسمبر 2003ء۔ اسلام آباد دل کے دورے سے جانبر نہ ہو سکے۔

مولانا شاہ احمد نورانی ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا مولانا عبدالحکیم میرٹھ کے مشہور عالم دین، مولانا کے والد مولانا حلیم صدیقی کا شمار بھی برصغیر کے چند نامور علمائے دین میں ہوتا تھا۔ مولانا عبدالحلیم تین اپریل 1892ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ درسِ نظامی کی سند جامعہ قومیہ میرٹھ سے حاصل کی۔ اٹاوہ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ 1917ء میں ڈویژنل کالج میرٹھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ عبدالحلیم صدیقی کو بچپن ہی سے روحانیت سے دلچسپی تھی اور کچھ گھر کے پاکیزہ ماحول کا تقاضا تھا۔ وہ برصغیر کے بے بدل عالم دین اور روحانی شخصیت حضرت احمد رضا خان (اعلیٰ حضرت بریلوی) خدمت میں حاضر ہوئے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بعد میں حضرت نے انہیں خلافت کے اعزاز سے نوازا۔ مولانا عبدالحلیم متعدد زبانیں جانتے تھے۔ انہوں نے 1951ء میں پوری دنیا کا تبلیغی دورہ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی، گیانا، سعودی عرب، ٹرینی ڈاڈ، ٹوباگو، امریکہ، کینیڈا، فلپائن، سنگاپور، ملائشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور سری لنکا کا دورہ کیا اور تمام مذاہب کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ پاکستان کے قائداعظم، مراکش کے غازی

عبدالکریم، فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی، اخوان المسلمین مصر کے قائد شیخ حسن البنا، سری لنکا کے جسٹس ایم مروانی، کولمبو کے جسٹس ایم ٹی اکبر، سنگاپور کے رہنما ایس این دت اور مشہور ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا صاحب نے متعدد ممالک میں خوبصورت مساجد بھی تعمیر کرائیں جن میں جامع مسجد حنیفہ کولمبو، سلطان مسجد سنگاپور، مسجد ناگریا جاپان قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے عربی یونیورسٹی ملائیشیا، پاکستان نیوز مسلم ڈائجسٹ، ٹرینی ڈاڈ، مسلم اینوول کی بنیاد رکھی۔ 1949ء میں سنگاپور میں تنظیم بین المذاہب قائم کی 1946ء میں اہلسنت علماء کی طرف سے بنارس میں بلائی گئی آل سنی کانفرنس میں شرکت اور تحریک پاکستان کی حمایت میں تقریر کی۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی صرف مقرر خطیب ہی نہ تھے مصنف بھی تھے ان کی تصانیف میں، ذکر حبیب دو جلدیں، کتاب تصوف، احکامِ رمضان، اسلام کی ابتدائی تعلیمات، مکالمہ جارج برنارڈ شا، مرزائی حقیقت وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے 12 اگست 1954ء کو مدینہ منورہ میں انتقال کیا، جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور ڈاکٹر فریدہ آپ کی اولادیں ہیں۔

مولانا شاہ احمد نورانی 1926ء میں میرٹھ کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانہ علم و ادب کے ساتھ ساتھ دین اور مذہب میں بھی نمایاں مقام کا حامل تھا۔ شاید اسی لئے اس خاندان کو پورے میرٹھ میں نہایت احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اس زمانے میں بھی اس گھرانے کو بڑی ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ مولانا شاہ احمد نورانی کے والد مولانا شاہ عبدالحلیم صدیقی بھی بہت بڑے مفکر، ممتاز عالم دین اور اسلام کے شیدائی تھے اس اس طرح ان کے بیٹے شاہ احمد نورانی میں بھی قدرتی طور پر روحانیت پیدا ہوگئی تھی ابھی مولانا شاہ احمد نورانی کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی کہ انہوں نے اس کم عمری میں اللہ کے بابرکت کلام قرآن مجید کو حفظ کر کے ایک بے مثال کارنامہ سرانجام دیا جس پر ان کے ہم عمر

بچوں کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ مولانا کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ دوسری جانب اس عہد کے جید علماء اور علمائے دین نے ان کو بہت شاباش دی اور ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ بلاشبہ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو اتنی سی عمر میں ان کو حاصل ہوا اس کے بعد مولانا کا علمی سفر آگے بڑھا اور وہ نوجوانی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنی علمی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے نیشنل عربیک کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ''عربی فاضل'' کی سند حاصل کی اور درس نظامی ''فاضل'' کی سند دارالعلوم عربیہ میرٹھ سے حاصل کی۔ مولانا کو سترہ زبانوں پر عبور حاصل تھا جن میں عربی، فارسی، انگریزی شامل تھیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی جمعیت علماء پاکستان کے صدر اور متحدہ مجلس عمل کے چیئرمین تھے۔ 1972ء میں انہوں نے مکتہ المکرّمہ میں دارالارقم کے مقام پر ورلڈ اسلامی مشن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ گیارہ سال تک ورلڈ مسلم آرگنائزیشن کے اعزازی جنرل سیکرٹری رہے انہوں نے بے شمار غیر مسلموں سے مناظرے کئے تھے اور ان کو مضبوط اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر شکست دی جس کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح فروغِ اسلام کا سلسلہ جاری رہا اور ان کی محنت اور کوششوں سے دنیا بھر کے لوگ اس زمانے میں بھی اسلام قبول کرتے رہے۔ 1970ء میں وہ کراچی سے پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے فوراً بعد اتفاق رائے سے جمعیت علمائے پاکستان (جے یو پی) کے لیڈر منتخب ہو گئے۔ اس وقت وہ پاکستان کے ایوانِ بالا یعنی سینٹ کے ممبر بھی تھے۔ مولانا نے تحریک پاکستان کے دوران بھی بہت اہم اور متحرک کردار ادا کیا انہوں نے مسلم نوجوانوں پر مشتمل نیشنل گارڈ فورسز کے دستے قائم کئے جنہوں نے نہ صرف تحریک پاکستان کے دوران اہم کردار ادا کیا تھا بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی اس نومولود پاکستان کی تعمیر اور استحکام میں حصہ لیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے قیام پاکستان کے بعد

1950ء میں میرٹھ سے ہجرت کی تھی۔ وہ اس بات پر بڑا فخر کرتے تھے کہ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم شاعر مولانا اسماعیل میرٹھی کے شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی ادبی حیثیت اور علمی مرتبہ کا ایک زمانہ معترف تھا اور آج بھی ہے۔ پاکستان آنے کے بعد بھی مولانا شاہ احمد نورانی دینِ اسلام کے فروغ اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کے لئے شب و روز کام کرتے رہے انہوں نے بہت سے غیر مسلموں کو تعلیم دی۔ یہ ان کی تعلیم کا فیض تھا کہ انکے ہاتھوں بے شمار غیر مسلموں اور خاص طور سے ان کے شاگردوں نے اسلام قبول کیا۔ پاکستان آنے کے بعد 1970ء تک کا عرصہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ساری دنیا کے دورے کرنے اور اسلام کا پیغام عام کرنے میں گزار دیا۔ مولانا کو اسلام سے بے حد محبت تھی۔ آپ رسولؐ کے عشق سے سرشار تھے، مولانا کی قرات سننے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ ہونٹوں سے قرآنی آیات کے پھول جھڑتے تو لوگ جھوم اٹھتے تھے۔ ان کی محفلوں میں ان کی قرات سن کر لوگوں کو روتے اور آنسو بہاتے دیکھا گیا ہے۔ رمضان کی مقدس، روح پرور اور بابرکت راتوں میں جب وہ تراویح میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے تو سننے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے اس وقت بھی دنیا میں ان کے معتقدین کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ مولانا کو ایک بڑا شرف یہ بھی حاصل ہوا کہ شہر نبی مدینہ کے ایک بہت بڑے مذہبی عالم اور رہنما کی صاحبزادی آپ کی زوجیت میں آئی تھیں۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جس پر مولانا کو زندگی بھر فخر رہا اور ان کی اولاد کو ہمیشہ رہے گا۔ مولانا کے دو صاحبزادے ہیں ان کی ایک بہن ڈاکٹر فریدہ اس وقت بھی قومی اسمبلی کی ممبر ہیں۔ مولانا ایک نرم مزاج خوش گفتار اور حلیم الطبع انسان تھے۔ ان میں قوت برداشت کا مادہ بہت وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔ ان کو کبھی مشتعل ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ اگر کبھی کوئی بات ناگوار گزرتی تو مسکرا کر ٹال دیتے اور اس کا دوبارہ تذکرہ بھی نہ کرنے دیتے۔ اپنے ماتحتوں دوستوں

ملازموں اور معتقدین کے ساتھ کمال شفقت سے پیش آتے تھے دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی اسلام کے خلاف بات ہوتی تو مولانا شاہ احمد نورانی سب سے پہلے اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ انہیں بلاشبہ اس صدی کا انسانی حقوق کا سب سے بڑا علمبردار قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ہر فورم پر مظلوم انسانیت کے لئے بالعموم اور مظلوم مسلمانوں کے لئے بالخصوص آواز اٹھائی۔ رسولؐ کے عشق سے سرشار یہ عالمِ دین نیکی کا بندہ تھا۔ صرف نیکی کرنا جانتا تھا برائی اس کی سرشت میں تھی ہی نہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی اسلام کے سچے پیروکار اور رسولؐ کے سچے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں سات بار حجِ بیت اللہ کی سعادت کا شرف حاصل کیا تھا۔ انہوں نے عمرے اتنی بڑی تعداد میں کئے تھے کہ ان کی گنتی ان کے چاہنے والوں کو معلوم بھی نہیں تھیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی کے خطبات کی کیسٹوں کی تعداد ساڑھے چار سو سے زاید ہے۔ دنیا بھر میں ان کے مداح اور پرستار بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مولانا دل کے مریض تھے ان کے دو بائی پاس ہو چکے تھے جن میں سے پہلا بائی پاس 1978ء میں جبکہ دوسرا 1986ء میں ہوا تھا۔ دل کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ان کے فولادی عزائم کم نہ ہوئے اور وہ موت کو مسلسل شکست دیتے رہے اور زندگی کو ساتھ لئے آگے بڑھتے رہے مگر گیارہ دسمبر 2003ء کی دوپہر کو وہ موت سے کافی عرصے سے جاری جنگ ہار گئے اور اس روز پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں علم دین کا یہ روشن آفتاب غروب ہوگیا وہ اسلام اور پاکستان کے لئے زندہ رہے اور اسلام آباد میں وفات پا کر ثابت کر گئے کہ انہیں اسلام سے کتنا پیار تھا۔

اللہ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

17 دسمبر 2003ء

سعودی عرب کی سیاست۔۔۔۔

سعودی دارالحکومت ریاض میں بی بی سی کے ایک کیمرہ مین کو ہلاک جبکہ ایک سینئر نمائندے فرینک گاڈنر کو شدید زخمی کردیا گیا۔ یہ واقع اکتوبر میں ہونے والے اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد رونما ہوا جس میں 22 افراد وہاں مارے گئے تھے۔ سعودی عرب کی سیاست اب ایک انتہائی خطرناک اور پیچیدہ موڑ سے گزر رہی ہے اور وہاں کے غیر یقینی حالات کسی بھی بڑی خبر کو کسی بھی لمحے جنم دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سعودی عرب کے ان حالات کا تعلق براہ راست امریکہ کے اس خطے میں پالیسیز سے جاملتا ہے اور انہیں سمجھنے کیلئے ہمیں 59 برس پیچھے جانا ہوگا جب یکم فروری 1945ء کی سہ پہر پہلی مرتبہ ایک امریکی جنگی جہاز یو ایف ایف مربی سعودی بندرگاہ جدہ کی حدود میں داخل ہوا تھا اور مملکت عربیہ السعودیہ کے بادشاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمان السعود کو لے کر وہ جہاز نہر سوئز میں لنگر انداز ایک اور امریکی جہاز یو ایف ایف مربی تک پہنچا تھا جس پر امریکہ کے اس وقت کے صدر روز ولٹ سعودی حکمران سے خفیہ ملاقات کے خواہش مند تھے دونوں رہنماؤں کے درمیان اس ملاقات میں جو کچھ طے ہوا تھا وہ آج 56 سال بعد کے عالمی حالات کی غالباً بنیاد کہلا سکتا ہے۔

روز ولٹ نے سعودی حکمرانوں کو مکمل تحفظ کی یقین دہانی کے بدلے وہاں کے تیل کے ذخائر تک امریکی رسائی حاصل کر لی۔ فروری 1945ء سے لے کر آج تک سعودی عرب نے صرف چار فرمانروا دیکھے ہیں سعود بن عبدالعزیز، فیصل بن عبدالعزیز، خالد بن عبدالعزیز، اور فہد بن عبدالعزیز جبکہ امریکہ میں آئزن ہاور کینیڈی، جانسن، نکسن، کارٹر، ریگن، بش سینئر اور موجودہ بش سمیت بارہ صدور گزر چکے ہیں تاہم سعودی سرزمین پر امریکی گرفت اس دوران مضبوط تر ہوتی گئی۔ سعودی امریکی تعاون 1979ء میں افغانستان میں سوویت مداخلت کے بعد ایک نیا رخ اختیار کر گیا کیونکہ اس دوران ایران میں امریکہ نواز شہنشاہ کا تختہ الٹ گیا اور سعودی شاہی خاندان کے خلاف ایک خطرناک بغاوت خانہ کعبہ پر مسلح قبضے کی کوشش کی صورت میں سامنے آچکی ہے چنانچہ امریکی صدر جمی کارٹر نے امریکی فوجی پالیسی میں ایک خاص تبدیلی کی جن کے مطابق کوئی بھی ایسی طاقت جو خلیجی ممالک میں جارحیت کا ارتکاب کرے گی وہ براہ راست امریکہ سے متصادم سمجھی جائے گی یہ پالیسی کارٹر پالیسی کہلاتی ہے۔ اور اسکے تحت کارٹر نے ایک ریپڈ ڈپلائے منٹ فورس تشکیل دی جو کہ امریکہ میں ویسٹ ہونے کے باوجود خلیجی ممالک میں کارروائی کیلئے ہر وقت تیار رہا کرتی ہے۔ اس فورس کو بعد میں امریکن سنٹر کمانڈ میں ضم کر دیا گیا۔ کارٹر نے خلیجی سمندروں میں امریکی بحری بیڑے تعینات کر دیئے اور کئی خلیجی ممالک بشمول عمان اور بحرین میں فوجی اڈے بھی حاصل کئے ان اقدامات میں ریگن کے دور میں تیزی آ گئی اور اس نے کارٹر پالیسی میں ایک اور شق کا اضافہ بھی کر دیا اور وہ یہ تھا کہ امریکہ کسی بھی صورت ایران کی طرح سعودی حکومت کو اندرونی بغاوت کے نتیجے میں گرنے نہیں دے گا۔ اسی لئے جب 2 اگست 1990ء کو عراقی فوجیوں نے کویت پر قبضہ کیا تو بش سینئر کو کویت کی نہیں سعودی عرب کی فکر تھی۔ 4 اگست 1990ء کو کیمپ ڈیوڈ میں فیصلہ کیا گیا کہ امریکہ کو فوجی کارروائی کے ذریعے

سعودی عرب کو بچانا ہوگا چنانچہ سیکرٹری دفاع ڈک چینی نے ریاض پہنچ کر سعودی حکومت کو قائل کیا کہ وہ امریکن فوج کو عراق سے دفاع کیلئے سعودی سرزمین پر آنے دیں اور پھر جو کچھ ہوا آپ دیکھ چکے ہیں۔

میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امریکی افواج کو کویت پر عراقی قبضے کے خاتمہ کے بعد وہاں موجود رہنے کی اجازت مل گئی اور امریکی طیارے سعودی فضائی اڈوں سے پرواز کرکے جنوبی عراق پر نوفلائی زون کی خلاف ورزی کرتے رہے تاکہ اس علاقے میں یعنی بصرہ کے نواحی علاقوں پر صدام حسین کی فوج شیعہ ٹھکانے پر بمباری نہ کرے۔ اس امریکی فوج کی سعودی سرزمین پر موجودگی کے تناظر میں اسامہ بن لادن کی آواز وہاں سے ابھری اور 1995ء میں پہلے ریاض کے ہیڈکوارٹر پر اور پھر 1996ء میں تہران کے باہر الخبیر ٹاور کو نشانہ بنایا گیا اور اس کے بعد کینیا اور تنزانیہ میں امریکی ایمبیسز حملوں کی زد میں آئیں اور پھر گیارہ ستمبر 2001ء کا سانحہ ہوا اور امریکہ نے سعودی عرب سے کئی ہائی جیکرز کے تعلقات کے علاوہ وہاں کے کئی خیراتی اداروں کو بھی اپنی دہشتگرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے باوجود اسے ہر حال میں موجودہ سعودی حکومت کو تحفظ فراہم کرنا ہے یعنی وہی 1945ء کا روزولٹ سعود معاہدہ جس کے تحت تیل کے بدلے سعودی حکومت کا تحفظ آج بھی امریکہ کیلئے ضروری ہے جس طرح 1945ء میں تھا۔ آج شاہ فہد کی عمر 83 سال کے لگ بھگ ہوگئی ہے اور 1995ء میں فالج کے حملے کے بعد تمام اختیارات شہزادہ عبداللہ کے پاس ہیں جو اس سال 80 برس کے ہو جائیں گے۔ شہزادہ عبداللہ فہد کے سوتیلے بھائی ہیں جبکہ شاہ فہد کے سگے بھائی یعنی وزیر دفاع سلطان اس وقت 79 سال کے ہیں اور وہ امریکہ میں سعودی سفیر بندر بن سلطان کے والد ہیں۔ یہی سلطان شہزادہ عبداللہ کے بادشاہ بننے کی صورت میں نئے ولی

عہد ہونگے۔ دو کروڑ 42 لاکھ آبادی کا سعودی عرب ان ملکوں میں سے ایک ہے جو سب سے زیادہ اندرونی قرضوں کا شکار ہے اور فی کس آمدنی وہاں پر 1980ء میں 23 ہزار آٹھ سو 30 ڈالر سالانہ تھی اب صرف دو ہزار پانچ سو 63 ڈالر سالانہ رہ گئی ہے آبادی وہاں 4/3 فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ اگلے دس سال میں سعودی عرب کو ستر لاکھ نئی نوکریاں پیدا کرنی ہونگی یعنی وہاں کی معیشت سات فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھنی چاہئے یعنی یہ کہ سعودی عرب کو ہر روز تین لاکھ بیرل تیل مزید پیدا کرنا ہوگا یہ بات ذہن میں رکھیں کہ پچھلے چالیس سال سے تیل کے نئے ذخائر کی تلاش کی کوشش یا تو سعودی عرب میں ناکام ہوئی ہے یا اسے بہت کم کامیابی ملی ہے۔ سعودی عرب اپنے کوٹے سے جو کہ 7.6 ملین بیرل یومیہ ہے 1.5 ملین بیرل یومیہ زیادہ تیل پہلے بھی پیدا کر رہا ہے یعنی 9 ملین بیرل کے لگ بھگ جبکہ اس کی زیادہ سے زیادہ طاقت صرف دس ملین بیرل یومیہ ہے۔

اب سعودی اور امریکی تعلقات پر نظر ڈالیں تو آج دنیا میں 290 ملین امریکی بستے ہیں یعنی دنیا کی کل آبادی کا 4.5 فیصد یہ 4.5 فیصد امریکی دنیا کے کل تیل کا 25 فیصد حصہ خرچ کرتی ہے۔ ایک معروف امریکی صحافی اپنی کتاب پلان آف اٹیک میں لکھتا ہے کہ 13 جنوری 2003ء کو امریکہ میں سعودی سفیر بندر بن سلطان عبدالعزیز نے صدر جارج بش کو ایک ملاقات میں یقین دلایا تھا کہ سعودی عرب اس سال نومبر میں ہونے والے امریکی صدارتی الیکشن سے پہلے اپنے تیل کی قیمت کم کر دے گا تا کہ صدر بش الیکشن جیت سکیں۔ لیکن ہوا کیا ہے۔ الخیر میں پچھلے ہفتے خونی جھڑپ کے بعد نیویارک ایکسچینج میں تیل کی فی بیرل قیمت 42.45 ڈالر یعنی بیس سالوں میں سب سے زیادہ ہوگی اور امریکن پٹرول پمپ پر تیل 2.05 فی گیلن تک پہنچ گیا یہ صدر بش کی الیکشن کمپین کیلئے اچھا شگون نہیں ہے کیونکہ امریکن اپنے بٹوے سے ووٹ ڈالنے کے عادی ہیں۔ تیل کی قیمت میں اس اضافے کی

وجہ یہ نہیں کہ مارکیٹ میں تیل کی کمی ہے کیونکہ دنیا کو 79.5 بلین بیرل تیل روزانہ چاہئے لیکن پیدا اس سے زیادہ یعنی 80.6 بلین بیرل ہوتا ہے۔ قیمت میں اضافے کی وجہ یہ ہے کہ مستقبل میں تیل کی پیداوار مشکوک ہوتی جارہی ہے سعودی عرب 262 بلین بیرل دنیا میں سب سے زیادہ تیل کے ذخائر کے ساتھ غیر یقینی سیاسی مستقبل کا شکار ہورہا ہے جبکہ عراق 115 بلین بیرل ذخائر کیساتھ دنیا کے یعنی دوسرے بڑے ذخائر ہونے کے ساتھ آپ جانتے ہیں کہ وہاں پر بھی غیر یقینی سیاسی مستقبل ہے۔ امریکی صدارتی امیدوار جان کیری تیل کی بڑھتی قیمت کو امریکن الیکشن کا ایک نعرہ بنا رہے ہیں یعنی سعودی عرب میں دہشتگردی کے مزید واقعات اور غیر ملکیوں پر حملے براہ راست تیل کی قیمت پر اثر انداز ہورہے ہیں اور دنیا کا 25 فیصد تیل خریدنے والا ملک امریکہ ظاہر ہے سب سے زیادہ متاثر ہوگا۔

8 جون 2004ء

جاگیرداری نظام کو ختم کر کے ہماری ترقی ممکن ہے

وطن عزیز میں آج ہر فائیو سٹار ہوٹل افطار پارٹیوں کی زد میں ہے جہاں میں خود تو نہیں جا سکتا لیکن عوام کی کثیر تعداد کو وہاں پر موجود چند مشہور شخصیات کے گرد منڈلاتا دیکھ کر افسوس ضرور کرتا ہوں جوان لوگوں کے درمیان بیٹھنے کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ جن کے منہ سے بڑھکیں باتوں سے جہالت، آنکھوں میں خیانت، کھال میں چربی ہاتھ میں موبائل فون اور گردن میں ایسا سریا ہوتا ہے جو عوام کو دیکھتے ہی تن جاتا ہے۔ ان محفلوں میں کسی وکیل کو کسی سیاست دان کے پاس دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی حواری اور درباری خوشامدوں کے دریا بہا رہے ہیں۔ ہر فیصلے پرواری جاتے ہیں۔ واہ واہ، ماشاءاللہ، چشم بددور، کیا خم ہے، کیا چال ہے، کیا دانش ہے، کیا اسٹروک کھیلتا ہے، کیا پینترا بدلا ہے کیا ڈنڈی ماری ہے، کیا ذہانت ہے، کیا دبدبہ ہے، کیا پیادہ چلا ہے، کیا گھوڑا کھینچا ہے، جنرل صاحب سے ڈائریکٹ لائن ہے۔ سبحان اللہ جمالی صاحب کے ساتھ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ امریکہ کے دورے سے ابھی واپس آئے ہیں۔ چوہدری صاحب کیساتھ کار میں بیٹھے تھے۔ سر آپ کی پلیٹ خالی ہوگئی ہے میں چکن لیکر آتا ہوں، نہ نہ سر آپ خود نہ اٹھائیں مجھے خدمت کا موقع دیں۔ کچھ دیر بعد یہی لوگ اٹھ کر دوسری میز پر چلے جاتے ہیں تو کلمات ہی بدل جاتے ہیں۔ صاحب

طاقت تو صرف بی بی کی ہے۔قوت تو صرف میاں صاحب کے پاس ہے۔امریکہ کی گود میں گروی رکھ دیا ہے اس ملک کو، آپ دوبئی جائیں تو سلام کہیے گا۔عمرے یا حج پر جائیں تو میاں صاحب کو آداب کہیے گا۔ابھی کل ہی قاضی صاحب کے جلسے کے لئے چندہ دیا ہے۔عمران خان کو شوکت خانم کیلئے لاکھوں کا چیک بھجوایا ہے۔میرا جی چاہتا ہے کہ سب کو با آواز بلند مخاطب کر کے کہوں ''اللہ آپ سب کو زندگی دے ہمت وخوشی دے اسی طرح نہا دھو کر سحری کھا کر شام کو افطار کر لیا کریں لیکن آپ میں سے وہ کون سے کم عقل لوگ ہیں جو ملک کو بچانے کیلئے 21ویں صدی میں بھی ایسے بیانات دے رہے ہیں''۔

میں آج سے ساڑھے چودہ سو سال واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں۔کوئی دکھائے تو سہی ایسا حکمران جو دریا کے کنارے مرنے والے کتے کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور لرز جاتا ہے، کوئی دکھائے ایسا رہنما جو میرے پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر کے جواب میں اپنے پیٹ پر دو پتھر رکھ لیتا ہے، دکھائے کوئی ایسا وزیر جو اپنے غلام کی سواری کی نکیل سنبھال کر اللہ کے راستے اس کی سمت روانہ کرے، دکھائے کوئی ایسا منصف جو اپنے لخت جگر کو کوڑوں کی سزا دے اور باقی سزا اس کے بے جان جسم سے حاصل کرے۔افطار پارٹیاں منعقد کر کے حرام کی دولت سے غریبوں کو زکوٰۃ دینے اور زکوۃ دیتے وقت ماڈلنگ کر کے تصویر بنواتے وقت کیا کوئی نہیں سوچتا کہ یہ نظام خود کشی کی طرف جا رہا ہے۔جمہوریت اور جاگیرداری نظام کبھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اگر جمہوریت مضبوط ہوتی تو ہمارے جاگیردارانہ نظام کو کھا جاتی لیکن ہمارا یہ جاگیردارانہ نظام اس قدر مضبوط ہے کہ وہ جمہوری نظام کو کسی طور پھلنے پھولنے نہیں دیتا۔تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں یہ جہاں جہاں موجود رہا وہاں سیاسی سطح پر بادشاہوں اور آمریتوں کو ہی جنم دیتا رہا۔جمہوریتیں جب ہی آسکیں جب یہ جاگیردارانہ نظام ٹوٹا۔زرعی معاشرہ منفی معاشرے میں تبدیل ہوا۔آج کی اسمبلی کی طرح پہلے

بھی ملک میں جمہوریتیں آئیں اور کیفیت یہی رہی کہ صرف 5 فیصد اَن پڑھ انگوٹھا چھاپ لوگ 95 فیصد سیٹوں پر قابض رہے لہذا تمام قانون ساز اداروں میں جو قوانین بنے وہ ان لوگوں کے مفاد کے لئے ہی تھے۔ مہنگائی بے روزگاری بیماری کی مار عوام کھاتے رہے۔ درمیانے طبقے کے لوگ نوکری پیشہ دکانداروں اور صنعتکاروں و ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبا دیئے گئے لیکن ان جاگیرداروں کو ٹیکسوں سے آزاد رکھا گیا۔

یہی جاگیردار فوج کے بھی معاون رہے اور انہی لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر مارشل لاء لگتا رہا ہے اور یہی لوگ فوج کی نگرانی میں تیار ہونے والی سیاسی جماعتوں اور حکومتوں میں بڑے بڑے عہدے سنبھالتے رہے۔ جمہوریت کا ڈنکا بجتا رہا اور وہ مارشل کی چھتری تلے یہ نمرودی خدائی کے دعویدار سیاستدان پاکستان کیلئے مصیبت بنے رہے۔ لمبی گاڑیاں درآمد ہوئیں۔ محلات، کوٹھیاں بھی بنتی رہیں۔ امراء کے بچوں کیلئے سکول اور بورڈنگ بھی تیار ہوتے رہے۔ لیکن کروڑوں عوام کیلئے سکول، ہسپتال، پبلک ٹرانسپورٹ تو درکنار صاف پانی کے دو گھونٹ کا انتظام کرنے کیلئے کسی کو فرصت نہ ملی اور نہ انصاف مل سکا کیونکہ یہ لوگ خود انصاف تک پہنچ کر اسے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ ان جاگیرداروں نے بہت سے مذہبی رہنماؤں کو بھی اپنا آلہ کار بنایا۔ طرح طرح کے فتوے دلوا کر لوگوں میں تفرقہ پیدا کیا ان کو فرقوں میں بانٹ دیا لیکن اس نظام کے خلاف جہاد نہیں کیا۔ 56 سالوں کے بعد یہ ملک ان لوگوں کی اجارہ داری میں ہی چل رہا ہے۔ انہی کے نام پر بینکوں سے کروڑوں روپے جاری ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہی وزارتیں ملتی ہیں۔ یہی سیاسی جماعتوں کے قائدین بنتے ہیں۔ سخت مخالفت کے نظریات کی حامل جماعتوں میں مختلف خاندانوں کے رشتہ دار آپس میں اس طرح مضبوط ہوتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ سے جا ملتے ہیں اور پھر نئے عہدے حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ جاگیردار آئے کہاں سے اور کیسے؟ اور یہ بات بھی ہے

کہ جس کے پاس بڑی بڑی جاگیریں اور ذمہ داریاں ہیں وہ صرف ملک وقوم سے غداری کے سلسلے میں انہیں ملیں یا ایسے روپے سے خریدی گئی جو بہرحال شرعی حدود میں کمایا نہیں گیا۔ یہ 1857ء سے 1947ء تک سفید فام آقائے دہلی کو ان کی ہر مشکل گھڑی میں رنگروٹ دیتے رہے۔ مخبریاں کر کے انگریزوں کو مفید معلومات مہیا کرتے رہے۔ اسلامی ممالک میں جاسوسیاں کرتے رہے اور اس سلسلے میں سرکاری زمینوں کو اونے پونے خریدتے رہے۔ 1857ء سے پہلے ہی زمینداریاں مسلمان بادشاہت کے لہو سے حاصل ہونے والے وثیقوں سے حاصل کیں۔ پنجاب کے اکثر بڑے خاندانوں کو ان کے بزرگوں کی انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں زمینیں اور شرکتِ اقتدار کا موقعہ ملا۔ جنرل نیکسن وہ سورما تھا جس نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا سر کاٹ کر تین روز تک بھوکے بادشاہ کو ناشتے کے طور پر پیش کیا تھا۔ ایک اور بڑے نواب کی وسیع وعریض جاگیر سید احمد بریلوی سے غداری کا صلہ ہے۔ ایک اور نواب زادے کی ریاست رہزنی کی یادگار ہے۔ جب انگریز وہاں امن قائم کرنے میں ناکام رہا تو یہ جاگیر انہیں دے دی گئی۔ ان کے پردادا اپنے علاقے کے مشہور ڈاکو تھے۔

کسی نے کہا کہ نشہ بڑھتا ہے جو شرابیں شرابوں میں ملیں، ایک صاحب نے تبصرہ فرمایا غصہ بڑھتا ہے اگر چیخیں چیخوں میں، آنسو آنسوؤں میں احتجاج احتجاجوں میں، تلخی تلخیوں میں اور حقائق، حقائقوں میں جاملیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر وہ دانشور دھوکہ، غداری اور مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہے جو عوام الناس کو فروعی، ثانوی اور بے معنی موشگافیوں میں الجھا کر انہیں اصل اور بنیادی حقائق سے بے خبر رکھتا ہے۔ جس دن سادہ لوح عوام کی سمجھ میں یہ ساری واردات آ گئی نظام بدل جائے گا۔ ایسا نظام جس کے انگ انگ میں زخم ہو چکے ہیں۔ مختلف اعضاء ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں سیاست دان سیاست دانوں کے بیری ہیں، بیوروکریٹ، بیوروکریٹس کے حاسد ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ صرف وہی ملک کا بیڑا پار

لگا سکتے ہیں۔ گلیوں محلوں، مساجد، بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے لئے آپ ہی کافی ہیں اور جو کام دشمن ہمارے لئے نہیں کر سکے ہم خود ہی اپنے لئے کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے ناموں اور شجروں والے آباؤ اجداد جو شیروں کی طرح للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں اس نظام کی پیداوار ہیں جس نے خود انگریز کے سامنے بلی کی طرح میاؤں میاؤں کر کے جنم لیا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ جب ان کے آباؤ اجداد ہمیں بیچ گئے تو پھر یہ ہمارا سودا کیوں نہ کریں کیا ضروری نہیں کہ ان لوگوں کو بھی سامنے لایا جائے جو انگریزوں کے ٹکڑوں پر پل کر آج قوم پر غراتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس ملک کے اشرافیہ، جاگیردار، یا فیوڈلز کہلاتے ہیں۔ فیوڈل ازم کا لفظ فیو یا فیوڈیا فیوڈم سے نکلا ہے یہ قرون وسطیٰ کی جائداد کی ایک قسم ہے جس کا ذکر قانون کی کتابوں میں ملا کرتا ہے۔ شاہ ولیم نے جب انگلستان کو فتح کیا تو اپنے سورماؤں میں جو جائیدادیں تقسیم کیں انہیں فیف کہا جاتا ہے جس میں یہ معاہدہ ہوتا تھا کہ فیف رکھنے والا بادشاہ کو سپاہی اور گھوڑے فراہم کرے گا۔ فیف رکھنے والوں کے لئے یورپ میں جو قوانین تشکیل دیئے گئے وہ فیوڈل قوانین کہلائے۔ ان کے قوانین کی مشہور کتاب میلا نکے ایک اطالوی مصنف نے لکھی، جس کے مطابق یہ جاگیر کسی عورت کو نہیں مل سکتی اور فوجی خدمت کے عوض دیا جا سکتا ہے۔ جب مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا تو فیوڈلز نے اپنے اختیارات میں اضافہ کیا اور اس افراتفری کے زمانے میں کسان طاقتور لوگوں کی پناہ میں آگئے۔ انہیں پناہ اس شرط پر دی جاتی تھی کہ وہ اپنی زمینوں کا حق ملکیت ان کے نام کر دیں، شہنشاہ اور حکمرانوں کے لئے مشکل ہوتا تھا کہ وہ مرکز میں اور اپنے پھیلے ہوئے علاقوں تک اپنی سلطنت برقرار رکھ سکیں اس لئے وہ علاقے تقسیم کر کے اپنے عہدیداروں افسروں یا مقامی فوجی عاملوں کو دے دیتے جو کہ جاگیر کی آمدنی کے عوض اس کی فوجی خدمت کرتے رہتے اور اس سے وفاداریاں کرتے اس میں

زمین، حکومتِ وقت کی ہوتی اور یہ بطور وراثت نہیں لی جا سکتی تھی جب نیا حکمران آتا تو وہ ان زمینوں پر قبضہ کر لیتا اور ان فیوڈلز کو رہنے دیتا جنہوں نے اس سے تعاون کیا ہوتا مگر جن لوگوں نے اس سے پہلے کے حکمرانوں کا ساتھ دیا ہوتا ان سے زمینیں چھین لی جاتی اور جاگیریں فاتحین اپنے وفاداروں کو دے دیتے۔ مثلاً ہندوستان میں جب ترک فاتحین آئے تو یہ اپنے ساتھ ترک اور ایرانی لوگ لے کر آئے جو ان کے عہد میں جاگیردار بنے۔ وفادار ساتھیوں کو جاگیریں دے دیں اور وفادار راجپوتوں کو وہیں پہ باقی رکھا۔ اس لئے کہ فیوڈلز کے لئے اپنی جائیداد اور مراعات کو باقی رکھنے کے لئے یہ بات ضروری تھی کہ وہ وقت کے ساتھ اپنی وفاداریاں بدلتے رہیں اور یہ ان کردار کا ایک لازم حصہ بن جاتا۔ ایک فیوڈل کے لئے سب سے اہم چیز چونکہ زمین تھی چنانچہ وہ زمین کے تحفظ کے لئے اخلاقی سماجی اصول اور قاعدے قوانین کو قربان کرنے لگا اور زمین کے مقابلے میں قوم، نسل، مذہب، ملک اپنی اہمیت کھوتے چلے گئے فیوڈلزازم کی بنیاد یہ بنی کہ جب کوئی سلطنت ٹوٹتی تو اس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے فیوڈلز اپنے اپنے علاقوں پر قابض ہو جاتے اور وہ مرکزی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے۔ مثلاً جب مغلیہ خاندان کا زوال ہوا تو کئی جاگیرداروں نے اپنے علاقوں پر قبضہ کر کے ان کی آمدنی کو خود ہتھیا لیا۔ نئی برطانوی حکومت کو اپنی حمایت کے لئے ایسے اثر ورسوخ رکھنے والے طبقے کی ضرورت تھی جو ان کے اور عوام کے درمیان وسیلہ اور رابطے کا کام کر سکے چنانچہ 1857ء کی جنگ اور پھر افغانستان برما کی لڑائیوں میں جو جاگیردار انگریزوں کے لئے خدمات سرانجام دیتے انہیں القابات اور زمینوں سے نوازا جاتا ایک ایسے ہی غدار اعظم کا نام مرزا الٰہی بخش تھا جو بہادر شاہ ظفر کا سمدھی تھا۔ اس کی غداری کے باعث دہلی اجڑی، بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوا اور اس کی ضعیف آنکھوں کے سامنے اس کے جوان بیٹوں کا خون ہو۔ مرزا الٰہی بخش کو اس کے صلے میں 28000 روپے سالانہ اور اسے

کے لئے ملکہ ہند کی تاج پوشی کے موقع پر خطاب کا اعلان ہوا اور اس کے بعد پورے ہندوستان میں ہزاروں مرزا الٰہی بخش پیدا ہوئے۔ سندھ جو سیاسی طوفانوں کا گڑھ بنتا جا رہا تھا وہاں اپنی حکمت عملی کے تحت سیاسی جاگیرداریاں پیدا کی گئیں۔ سندھ میں انگریز دور سے پہلے 372 جاگیرداری گرانٹس تھیں جو دس لاکھ 76 ہزار 500 ایکڑ پر مشتمل تھیں یہاں مزید بائیس گرانٹس جن کا رقبہ 315 ایکڑ بنتا تھا عنایت کی گئیں خصوصاً چانڈیو قبیلے کی سرپرستی کی گئی۔ جن لوگوں جاگیریں دیں ان میں میر علی مراد تال پور، میر ولی محمد تال پور، میر غلام حسین تال پور، محمد خان جمالی، خان گھٹانی، علی بخش ہروگری، میر علی بخش ملکان، پیر شمس الدین اسفندی اور دیگر لاتعداد جاگیردار شامل تھے یہ سب انگریزوں کی مہربانیوں سے سیاست میں رونما ہوئے۔ بلوچستان کے سرداروں کا کردار بھی تاریخ عجیب انداز میں بیان کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے عوام کو انگریزوں کی غلامی میں دے کر اپنی عیش و عشرت کا سامان کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہ سردار اعظم خان آف قلات کی ریاست سے وابستہ تھے اور قیام پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ بعد میں جب انہوں نے صوبے کی عوام کا رجحان دیکھا تو بادل نخواستہ پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ ان کا حل یہ تھا کہ قبیلے کا کوئی فرد ان کے قدموں کو ہاتھ نہ لگاتا تو ان کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ آج بھی یہی حال ہے۔ ان سرداروں میں پیر آف جھانسواوالہ، سردار دودو خان، سردار خان محمد حسینی سردار فقیر محمد بزنجو، اکبر خان بگٹی، سردار عطاء اللہ خان، سردار کھیتر ان جیسی ممتاز شخصیات بھی شامل تھیں۔ سرکار برطانیہ کی طرف سے پہلے پہلے وظائف لینے والے جو بلوچستان کے سردار تھے ان میں سردار رئیس ہانی تین سو روپے ماہانہ، وڈیرا افضل زئی تین سو روپے ماہانہ، سردار لہری تین سو روپے ماہانہ، سردار شہوانی 350 روپے ماہانہ اور سردار محمد مصری تین سو روپے ماہانہ۔ پھر جب میر محمد خان آف قلات کے دور میں انگریزوں کے خلاف قبائل نے آواز اٹھانی شروع کی تو مزید

سرداروں کو وظیفہ انگریزوں نے شروع کردیا۔ سردار مینگل تین سو روپے، سردار حسینی تین سو روپے، سردار بزنجو 70 روپے ماہانہ، نوشیروانی پانچ سو روپے ماہانہ، سردار اختانی دو سو روپے ماہانہ۔

پنجاب میں اس مقصد کے لئے یونینسٹ پارٹی قائم کی گئی تھی اور پنجاب کا کوئی ایسا جاگیردار خاندان ایسا نہیں تھا جس نے اس چھتری کا سایہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان بزرگان کو خاندانی طور پر سر نواب خان بہادر کے القابات ملے ان کے بیٹوں کو تحصیلداریاں۔ اس طبقے کا ایک ہی کام تھا کہ یونین جیک کے اقتدار کا سورج کبھی غروب نہ ہو۔ جب کوئی گورا جاگیردار کے پاس آتا تو یہ لوگ اس کے لئے دربار کا انتظام کرتے اور اپنی رعایا سے پوچھتے کہ وہ کس حال میں ہیں۔ جاگیروں میں بسنے والے بے بس عوام ایک آواز میں کہتے کہ آپ مائی باپ ہیں ہم لوگ خوش ہیں۔ ہمارے ہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔ لاہور سے علامہ اقبال کے داماد یونینسٹ پارٹی میں تھے اور ملتان کے خان بہادر مشتاق گورمانی، عاشق حسین قریشی اور مخدوم رضا شاہ بھی اس جماعت میں تھے۔ سردار حبیب اللہ موکل بھی اس جماعت میں تھے جو کہ اعتزاز احسن کے نانا تھے اور گوجرانوالہ کے نصر احمد چٹھہ بھی اس پارٹی میں سے تھے جو کہ حامد ناصر چٹھہ کے دادا تھے۔ ڈیرہ غازی خان سے نصر اللہ خان دریشک کے والد سردار بہادر خان بھی اسی جماعت سے تھے اور عابدہ حسین کے تایا اسی پارٹی میں سے تھے تاہم صوبہ سرحد میں پنجاب کے برخلاف یونینسٹ پارٹی کے بڑے بڑے برج 1937ء میں الٹ گئے اور ان میں شکست کھانے والوں میں عبدالغفور ہوتی کے والد عبدالخان ہوتی، ارباب جہانگیر کے والد ارباب شیر علی خان شامل تھے۔ 1937ء ہی کے الیکشن میں سندھ کی 62 میں سے ہر نشست پر دو جاگیرداروں کا ٹکراؤ تھا۔ صرف لاڑکانہ کی سیٹ تھی جہاں مدمقابل کی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بے نظیر بھٹو کے دادا شاہنواز

بھٹو تھے جنہیں انگریز سرکار نے OBE کا خطاب دیا تھا۔ ان کو 1921ء میں خان بہادر 1925ء میں شیر ہند 1937ء میں سب سے بڑا سر غلام کا خطاب ملا تھا، ان کی انتخابی مہم میں پیر علی راشدی جیسے دانشور بھی شامل تھے۔ سر شاہنواز بھٹو کا مقابلہ شیخ عبدالمجید سندھی سے تھا لیکن شاہنواز بھٹو شکست کھا گئے۔ عبداللہ ہارون بھی اس الیکشن میں ہار گئے۔ 1937ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیراعلیٰ سندھ بنے جن کی سیاست رنگ بدلنے والی سیاست کے طور پر مشہور تھی۔ وہ 1935ء سے 1945ء تک ہر ایسی وزارت میں شامل رہے جہاں انہیں اقتدار مل سکتا تھا حتیٰ کہ جب ان کی وزارت اعلیٰ کا تختہ الٹ دیا گیا تو وہ اپنے سخت مخالف خان بہادر کے ماتحت بھی کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ میں وقتاً فوقتاً تاریخ کے ان اوراق کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جن کو ہم سے اوجھل کرنے کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی ہے اور جس ملک کے سیاسی نظام کو مال غنیمت سمجھ کر چند سیاسی شاطر پچھلے 56 سالوں سے آپس میں تقسیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہاں مستقبل کا کوئی خانہ اس وقت تک ترتیب نہیں پا سکتا جب تک ہم اپنے ماضی سے کچھ سبق سیکھنے کی کوشش نہ کریں۔ فاطمہ جناح اور ایوب خان سیاسی معرکہ پر نظر ڈالیں اور اس دور کے اخبارات کو دیکھیں تو آپ کو عجیب بیانات نظر آئیں گے مثلاً پیر پگارا کا بیان کہ فاطمہ جناح کا انتخاب ملک کے مفاد کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ حیدرآباد سے پیر غلام رسول کا بیان کہ فاطمہ جناح صدارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی پہلے مسلم لیگ میں تھے پھر ریپبلکن میں گئے پھر پیپلز پارٹی میں اور پھر نیشنل پیپلز پارٹی بنائی ان کا بیان تھا کہ فاطمہ جناح کی نامزدگی ایک المناک واقعہ ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال فاطمہ جناح کے ساتھ تھے اور بڑے بھائی آفتاب اقبال ایوب خان کے ساتھ تھے۔ ممتاز صنعت کار صدیق داؤد ایوب خان کے ساتھ تھے اور ان کے بھائی فاطمہ جناح کے ساتھ سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے اس وقت یہ بیان دیا تھا کہ صدر ایوب مخالفین

کا پردہ فاش کر کے فاطمہ جناح کو عبرتناک شکست دیں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دس اگست 1964ء کو سندھ کے ایک جلسے میں کہا کہ سندھ کے عوام ایسے ناشکرے نہیں کہ ایوب خان کے احسانات کو فراموش کر دیں۔ خود ایوب خان نے 22 اکتوبر 1964ء کو کہا کہ فاطمہ جناح' پاکستان کو اپنی جائیداد سمجھتی ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے وہ غداروں کی ایک پناہ گاہ بن چکی ہیں۔ چوہدری خلیق الزمان پوری شد و مد کے ساتھ یہ اصول بیان کرتے تھے کہ اسلامی ریاست میں حاکم اعلیٰ کو لازماً آمرانہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں سات نومبر 1963ء کو چوہدری خلیق الزمان کا یہ بیان ڈھاکہ کی پریس کانفرنس میں آیا کہ خلفائے راشدین مجلس شوریٰ سے مشورہ کرتے تھے لیکن ان کے مشوروں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ان کے اپنے پاس تھا۔ اس نے مزید کہا کہ آخری فیصلے کا اختیار اسمبلی کو سونپنا ایک ایسا فیصلہ ہے کہ جس میں اسلام کے لئے کوئی گنجائش نہیں لیکن مذہبی نقطہ نظر سے ایوب خان کے لئے سب سے زیادہ خوش آئند جو بیان تھا وہ ممتاز روحانی شخصیت کی طرف سے آیا۔ یہ جو شخص تھا پیر آف دیول شریف تھے ان کا کہنا تھا کہ میں نے تین فقراء کے ساتھ لاہور میں داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دی اور مراقبہ میں بیٹھ گیا۔ دل میں سوال تھا کہ فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان داتا صاحب کا کیا فرمان ہے۔ مراقبے کے درمیان داتا صاحب نے فیصلہ سنا دیا کہ جب تک فاطمہ جناح صدارتی امیدوار رہیں گی تب تک ملک سے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروازے بند رکھے گا۔

میرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

19 نومبر 2003ء

بیوروکریسی اور سول سروس

پچھلے چند دنوں سے ہم جاگیردارانہ نظام پر بات کرتے رہے ہیں جو کہ اس خطے میں قوت کے پیکر ہیں لیکن آج ہم بیوروکریسی اور سول سرونٹ پر بات کرتے ہیں۔ پاکستان کی پہلی دو دہائیوں میں بیوروکریسی کا قبضہ تھا اور نہ سیاسی قیادت یا فوج غالب تھی۔ تاجِ برطانیہ کے دور میں بیوروکریسی اور نوکرشاہی کا ایک منظّم گروپ تھا جو کہ معزز اشخاص کی بھرپور حفاظت کیا کرتا تھا۔ پاکستان نے یہ سب ورثے میں پایا اور اس کو مزید شناخت دی۔ مرکز میں خواص کے ساتھ انتظامی مشینری کا ڈھانچہ اس حقیقت پر چلایا جاتا تھا کہ مرکز میں برطانیہ کو اس چھوٹے سے منظّم گروپ پر اعتماد ہوتا تھا جو کہ تاجِ برطانیہ کے محافظ تھے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں ضلعی انتظامیہ اور مجسٹریٹی نظام میں اس خاص کیڈرز سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لئے اسامیاں مخصوص ہوتی تھیں جو سارے نظام کو کنٹرول کرتی تھیں اور مقامی لوگوں کو نچلے درجے کے معاملات کنٹرول کرنے کے لئے بھرتی کیا جاتا تھا۔

پاکستان میں انڈین سول سروس (ICS) کا سول سروس کی شکل میں احیاء کیا گیا جس میں پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں پانچ لاکھ سے زیادہ ملازمین بھرتی کئے گئے تھے۔ پاکستان میں سی ایس ایس کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر لینے والوں میں سے تقریباً 12 سے زیادہ افراد سی ایس پی میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ اس امتحان کے نتیجے میں بارہ کیڈرز میں لوگ بھرتی کئے جاتے تھے جن میں اکیس سال سے چوبیس سال تک کی عمر کے

جوان مقابلہ کے لئے آتے تھے۔ بعد میں ہونیوالی تربیت اور ابتدائی بھرتی پبلک سروس کمیشن کرتا تھا جس کی خودمختاری کی خصوصی طور پر حفاظت کی جاتی تھی۔ اس کو بھی سی ایس پی آفیسر ہی چلاتے تھے۔ یہ ایک بند قلعہ تھا اپنے آپ میں محبوس ایک ہی طرح کی ذات برادری کیونکہ اس کی رکنیت صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص تھی جو امتحان دینے اور منتخب ہونے کے طے شدہ مراحل سے گزرتے تھے۔ تمام سی ایس پی آفیسر اکٹھے ہو جاتے تھے اور ایک آفیسر ہر فیصلہ پورے اعتماد کے ساتھ کرتا تھا کیونکہ تمام کیڈرز کی حمایت اسے حاصل ہوتی تھی۔ یہ اس کی مضبوطی کا راز تھا یعنی ایک ٹھوس مضبوط اتحاد، تقسیم ہند کے بعد یہ ضروری نہیں تھا کہ انڈین سول سروسز کو پاکستان میں جاری رکھا جاتا کیونکہ آزادی کی جدوجہد کے دوران خود مسلمانوں نے اس کی مزاحمت کی تھی۔ یہ سوچ کر کہ یہ انتظامی ڈھانچہ مفتوحہ لوگوں پر فاتحین کی حکمرانی کیلئے وضع کیا گیا تھا۔

آزادی کے بعد پیش آنے والے حالات میں ان عوامل پر غور نہیں کیا گیا اور قیام پاکستان کی پہلی دہائی میں نوکرشاہی کا سیاسی منظرنامے پر غلبہ نظر آیا اور سیاسی قیادت مکمل طور پر اس نوکرشاہی کے زیر اثر تھی۔ سامراجی دور میں مسلمہ قانونی طریقہ کار سیاسی افراد اور وزیروں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے موجود تھے۔ یہ طریقہ کار 1921ء میں بنائے گئے، جب 1919ء میں گورنمنٹ ایکٹ آف انڈیا کے تحت صوبائی سطح پر پہلی مرتبہ ہندوستانی وزراء مقرر کئے گئے تھے۔ اس نظام کو دوہری حاکمیت کہا جاتا تھا۔ جس کا مقصد ہندوستانی وزراء کو صوبائی سطح پر ادنیٰ سی وزراتیں دینا تھا کیونکہ انگریزوں کے لئے ہندوستانیوں کے ماتحت کام کرنا ہتک آمیز تھا۔ اس لئے چند افسران نے استعفے دے دیئے تھے اس کے بعد آئی سی ایس افسران اور ہندوستانی وزراء کے درمیان وسیع بحث و مباحثہ ہوا تھا جس میں طے پایا تھا کہ تمام ہندوستانی وزراء ان آفیسر کے ماتحت رہیں گے اور وہ اہلکار

وزراء کو حکومت کا فن سکھائیں گے۔

وزیر اور سیکرٹری کے درمیان جو تعلق تھا وہ اس قانون کے بعد الٹ گیا اور یہ طے پایا کہ سیکرٹری وزیر سے اختلاف کی صورت میں صوبائی گورنر سے احکامات لے سکتا ہے۔ اس کے بعد وزیر اس کے معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ قانون پاس ہو گیا ہندوستان کے وزیر اپنے سیکرٹری کے غلط رویہ اور عدم تعاون کی شکایت کرتے اور ان کی شکایات کو ایک کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا جاتا جو خود انہیں افسران پر مشتمل تھا اس طرح سیاستدانوں کو کوئی مراعات نہیں ملتی تھیں اور افسر شاہی کے پاس ان سے پہلو تہی کرنے کی طاقت برقرار رہتی قیام پاکستان کے بعد نوکر شاہی کو کسی سازش کی ضرورت نہیں تھی۔ جس سے وہ اپنے افسران کی اتھارٹی کو چیلنج کرتے۔ اس دور کا مشہور سیاسی مبصر کینس لارڈ 1950ء میں ایک کالم میں لکھتا ہے کہ پاکستان میں کئی سیاسی پارٹیاں مشکلات سے گزریں۔ سیاسی قائدین نے دلیلیں دی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو کمزور کرتے ہیں۔ مذہبی لوگوں نے اتھارٹی پر مکمل دعویٰ کر دیا ہے مگر حاصل نہیں کر پائے لیکن اس دوران سول سروس ملک کو فوج کی پشت پناہی سے چلاتی ہے اور وہ ایسے ہی پہلے بھی چلاتی رہی ہے اور آئندہ بھی غالباً ایسا ہی کرے گی لیکن اکثر یہ جو نوکر شاہی تھی یہ خود حکومتوں کے تمام سیاسی کنٹرول سے نکلتی چلی گئی اور ریاست میں اس نے بذات خود فیصلہ کن اجارہ داری کی صورت اختیار کر لی، پارلیمانی طرز کی وہ حکومتیں جیسے ہمارے ہاں پرائم میل کے بعد نوکر شاہی کا ڈھانچہ وزارتوں میں تقسیم ہوتا ہے ہر وزارت کا سربراہ ایک سیکرٹری ہوتا ہے اور وزارت وزیر اعظم کے تحت کابینہ کے ذریعے مضبوط کی اور چلائی جاتی ہے۔

قیام پاکستان کے فورا بعد اس دور میں ایک اور انوکھا عہدہ تشکیل کیا گیا جو کہ سیکرٹری جنرل گورنمنٹ آف پاکستان کا تھا، جو کابینہ سے آزاد ہر وزارت اور سیکرٹری پر

اتھارٹی رکھتا تھا، وہ وزارتوں کے سیکرٹریز کی کمیٹی کی صدارت کیا کرتا تھا، یہ ایک طرح سے سپر کیبنٹ ہوا کرتی تھی، سیاسی کیبنٹ سے ہٹ کے جو کہ موثر پالیسیز کو واضح اور مربوط کرتی تھی۔ اس طرح سے وہ سیاسی کابینہ کو محض ایک سائے میں بدل دیا کرتی تھی، اگست 1973ء میں انتظامی اصلاحات کا اعلان کر کے سی ایس پی کی شکل بدل دی گئی اور کامن سسٹم کا اجراء ہوا۔

1973ء کے بعد اب بھرتی ہونے والے سول آفیسرز کامنرز کہلاتے ہیں۔ سول ملازمین کو 13 گروپوں میں جو حکومت کے محکموں کی نمائندگی کر سکیں تقسیم کر دیا گیا، سب ان گروپوں کے نام سے واقف ہیں، اکاؤنٹ، کسٹم، ایکسائز، گروپ، ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ یا ڈی ایم جی، پولیس سروسز، انکم ٹیکس گروپ، آفس مینجمنٹ گروپ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ آفیسرز کی دو یا زیادہ گروپس میں حرکت بھی ہوا کرے گی، پھر لیٹرل انٹری کا گروپ بھی کھول دیا گیا، جس کے تحت مختلف پیشوں، پرائیویٹ، کاروباری اداروں اور دوسرے شعبوں سے لوگوں کو حکومت کے سینئر جو عہدے تھے یا آسامیاں تھیں ان پر براہِ راست بھرتی کیا جانے لگا، اس طرح افسر شاہی کا جو غلبہ تھا، اسمیں ذات برادری یا جو سی ایس پی کا انتظام تھا اس پر زبردست ضرب لگی، ۔ وقار احمد پہلے وفاقی سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ تھے جو سی ایس پی آفیسر نہیں تھے۔ جو وزیراعظم بھٹو کے براہِ راست ماتحت کام کرتے تھے اسی دور میں ایک اور قانونی ترمیم کی گئی کہ کسی بھی درجے کا آفیسر اگر اس نے 25 سال کی سروس پوری کر لی ہے تو اسے بغیر کارروائی کئے ریٹائرڈ کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے برطرفی کا طریقہ کار عدالتی اور پیچیدہ تھا۔

عام دعوے کے برخلاف قیام پاکستان کے بعد گورنر جنرل قائداعظم ریاستی مشینری پر پوری طرح قابو رکھتے تھے اور اپنے انہی اداروں سے قوم کے روزمرہ معاملات کو

فروغ دینا چاہتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی پہلی حکومت میں قائداعظم محمد جناح بہت زیادہ بیمار تھے اور ریاست کے تمام معاملات اپنے کنٹرول میں لینے سے معذور تھے اور جن اہلکاروں پر وہ اعتماد کرتے تھے وہ حکومت چلانے کیلئے آزاد تھے۔ آس پاس وہ سیاسی رہنما تھے جنہیں قائداعظم کھوٹے سکے کہتے تھے چنانچہ گورنر جنرل کے عہدے کے غیر معمولی اختیارات کی چھتری تانے وہ سرکاری اہلکار مضبوط ہونے لگے جو نہ صرف کابینہ بلکہ پارلیمنٹ کی اتھارٹی کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد انڈین ایکٹ 1947ء کی دفعہ 9 کے تحت گورنر جنرل کو دستور بنانے کے اختیارات سات ماہ کیلئے دیئے گئے۔ اس دفعہ کے تحت اپنے حکم سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1937ء میں بھی گورنر جنرل ترمیم کر سکتے تھے۔ گورنر جنرل کے ان اختیارات میں ایک سال کی توسیع کر کے انہیں 31 مارچ 1949ء تک بڑھا دیا گیا۔ اس دور میں قائداعظم اور لیاقت علی خان جیسی شخصیات جو تھیں ان کے نام سے سول سروس کے اہلکار موثر طریقے سے تمام صوبائی آسامیوں کو کنٹرول کرتے رہے اور سیاست دانوں کو مرکزی حکومت کے احکامات بجالانے کی شرط پر حکومت میں رکھا جاتا تھا۔ مثلاً جولائی 1948ء میں گورنر جنرل کے حکم سے ایک نئی دفعہ 52-A قانون میں شامل کی گئی جس کے تحت گورنر جنرل کو صوبوں میں دستور ساز اداروں کو بہتر کر کے صوبائی گورنر کو حکم دینے کے اختیارات مل گئے۔ یہ اختیارات بھی کئی صوبوں میں استعمال ہوئے۔ عام تاثر یہ بھی ہے کہ افسر شاہی، نوکر شاہی یا بیوروکریسی اسی وقت سے مقدس گائے کی صورت ہمارے سروں پر ایک انتہائی طاقتور نادیدہ قوت بن کر سایہ فگن ہے جو ہر ناممکن کو ممکن بنانے کا فن رکھتی ہے۔ حکومتیں گرادیتی ہے اور کھڑی کردیتی ہے، تحریک چلادیتی ہے اور جو بھی چاہے کر سکتی ہے۔

10 نومبر 2003ء

بادِسموم

ٹھیک 32 سال پہلے ہمارے ملک کے ایک صوبے کی ندیوں میں اس وقت پانی سے زیادہ انسانی خون بہہ رہا تھا۔ فضاؤں میں چیلوں اور کوؤں کا راج تھا مردہ لاشوں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ مردار جانور بھی کھانے سے قاصر تھے۔ لسانی اور نسلی تعصب کیساتھ ساتھ گلی سڑی انسانی لاشوں کی سرانڈ سے اس خطہ کی ہوائیں انسانی ہمدردی محبت اور رواداری کیلئے بادِسموم بن کر رہ گئی تھیں۔ لاکھوں بنگالی اور غیر بنگالی مگر پاکستان کے وفادار اور مخالف تسبیح کے دانوں کے طرح ٹوٹ پھوٹ کر گر اور مر رہے تھے۔ اگر بھارت درمیان میں نہ آتا تو کیا ہوتا اگر وہ غیر جانب دار رہتا مداخلت نہ کرتا بنگالی باغیوں کی مدد نہ کرتا بین الاقوامی سرحد پار کر کے حملہ آور نہ بھی ہوتا تو پھر کیا ہوتا۔ کیا یہ نہ ہوتا کہ دونوں فریقین کا اتنا خون بہہ جاتا کہ دونوں جان ہار جاتے اور فائدہ کسی تیسرے فریق کو پہنچتا۔ کسی سرزمین پر فتنہ کی زیادہ عرصہ موجودگی شاید قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔

ذمہ داران کا تذکرہ چلا ہے تو اکیلے ان کو بھی اس صورتحال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک عام فیکڑ بیوروکریٹس کا بھی تھا ملک آزاد ہوا تو مشرقی پاکستان کی انتظامی مشینری میں بنگالی آئی سی ایس آفیسرز زیادہ تر ہندو تھے وہ بھارت چلے گئے۔ لے دے کے صرف ایک مقامی آفیسر جو کہ مسلمان تھا مشرقی پاکستان کے حصہ میں آیا اس خلا کو پر کرنے کیلئے مغربی پاکستان سے آئی سی ایس آفیسرز مشرقی پاکستان میں تعینات کیے گئے جو زیادہ تر پنجابی

یا اردو بولنے والے یعنی مہاجر تھے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان کیلئے سول سروس اور دوسری ملازمتوں کیلئے کوٹہ مخصوص کیا گیا اس نتیجے میں صورتحال خراب ہوئی لیکن 1970ء تک بھی آبادی کے تناسب کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں سول سروس کا حصہ تقریباً 41 فیصد کم تھا اور مغربی پاکستان کے افسران مشرقی پاکستان میں مختلف اسباب کی بنیاد پر مقرر کیے جانے لگے۔

قومی وحدت کیلئے ایک حصہء مملکت سے دوسرے حصے میں افسران کا تبادلہ اور تقرر نہ صرف درست بلکہ فرض تھا لیکن بدنصیبی سے اس اہم ترین مرحلے پر عمل درآمد کے سلسلے میں مجرمانہ بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا گیا یا پھر سازش کے تحت ایسے افسران چن چن کر مشرقی پاکستان بھیجے جاتے جو وہاں مزید نفرت کا سبب بنتے کیونکہ بنگالی عوام کیلئے یہی لوگ مغربی پاکستان کے نمائندے ہوا کرتے تھے اور بعض سیاسی حکمران جنہیں وہاں تعینات کر دیا گیا وہ بھی سابق بیوروکریٹ تھے مثلاً صدر ایوب کے دور کے گورنر ذاکر حسین۔ وہ سابق آئی جی پولیس تھے جنہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن سمیت کئی سیاست دانوں کو گرفتار کر کے انہیں اذیتیں دیں۔ جنرل اعظم خان جو مشرقی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹر تھے وہ ایک شریف آدمی تھے اور وہاں کے لوگوں کے دلوں میں کچھ جگہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں وہاں سے کھینچ لیا گیا اور ان کی جگہ ایک خالص بیوروکریٹ غلام فاروق کو مشرقی پاکستان کا حاکم بنا دیا گیا جنہیں وہاں کے عوام کا کوئی احساس نہ تھا۔

صدر ایوب خان کے دور میں بیوروکریٹس کو ہر مرض کا تریاق سمجھ لیا گیا۔ معروف مصنف لورنس رائیڈنگ اپنی کتاب پاکستان اینڈ پولیٹیکل ڈویلپمنٹ میں لکھتا ہے کہ ایوب خان کے نزدیکی بیوروکریٹس کو یقین تھا کہ صرف اسلام ملک کو متحد رکھنے کیلئے کافی نہیں ہے اسی کتاب میں ''سی ایس پی افسران ایوب خان کے دور میں'' اس پر روشنی ڈالتے ہوئے

لکھا ہے کہ 400 سی ایس پی افسران ملک کے سیاہ سفید کے مالک تھے عوام میں ناراضگی ان کی اہلیت یا کارکردگی پر نہیں تھی بلکہ ان کے رویے پر تھی۔ یہ ایک بند انجمن تھی جس کے ذہنوں پر حکمانہ انداز اختیار کرنے کے ساتھ یہ خیال بھی نقش ہو چکا تھا کہ پاکستان کی بقا انہیں کے دم سے ہے۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن لیڈر مولوی فرید جبار، مجیب الرحمٰن کی مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ انہوں نے اپنا مشہور جملہ اس طرح ادا کیا کہ "ملک کی سب سے بڑی منظم جماعت سول سروس آف پاکستان ہے" چنانچہ عوام بیزار خود پسند آفیسرز چن چن کے پھولوں اور پانیوں کی سرزمین پر جا گرے۔ وہ علاقے جہاں کے سادہ لوگ محض مسکراہٹ سے بات کر لینے سے جان فدا کر دیتے ہیں لیکن جب کوئی ان کی توہین کرے تو پھر وہ نفرت کی تمام حدیں بھی پار کر جاتے ہیں۔ نفرت میں بھی شدت محبت میں بھی شدت۔ ایک لمحہ میں شبنم دوسرے میں شعلہ۔

جو پرانے افسران تھے ان کے مزاج میں انگریزیت رچی ہوئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے گاؤں کے لوگ مغربی پاکستان سے آنے والے افسران کو دیکھتے تو انہیں وہ گورے صاحب لوگ اسی یورپی لباس میں انگلش بولتے اجلاس فرماتے نظر آتے اور الطاف گوہر بھی اپنے مضمون میں یہ لکھتے ہیں جس ضلع میں وزیر اعلیٰ کے تعلقات اچھے ہوتے وہاں بنگالی افسران بھیجے جاتے جہاں اکڑاؤ اور مخالفت کی نوبت آتی تو وہاں مغربی پاکستان سے کوئی افسر بھیج دیا جاتا جو وہاں جا کے شرپسندوں کی سرکوبی کرتا، دوسری طرف اکثر مشرقی پاکستانی افسران نے ہندو دانشوروں اور پروفیسر سے تعلیم پائی۔ وہ مغربی پاکستان سے آنے والی اکڑی گردنوں کے رویوں سے تنگ بنگالی عوام میں یہ تعصب قائم کرنے میں کامیاب رہے کہ مشرقی پاکستان کو صرف مغربی پاکستان کی کالونی سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ انہیں پنجابی لوٹ رہے ہیں۔ 1954ء کے الیکشن میں مولوی فضل الحق جیسے رہنما نے ایک جلسے میں ٹیلی

گرام یا تار کا ایک فارم اٹھا کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ لوگو یہ تار کا فارم ہے مغربی پاکستان کے امیروں کو مفت ملتا ہے انہیں منی آرڈر فارم بھی مفت ملتا ہے۔لیکن آپکا بیٹا بیمار ہو آپ اس کو پیغام بھیجنا چاہیں تو آپ کو یہ فارم تین پیسے میں ملے گا۔ میں واضح کرتا چلوں کہ یہ فارم مغربی پاکستان میں بھی مفت نہیں ملتا تھا۔

غلط فہمیاں دوریاں اور اس میں ایک اہم کردار اقتصادی عدم مساوات بھی ہے۔ آپ سقوط ڈھاکہ پر بنگالی دانشوروں یا غیر ملکی مصنفین کی کتابیں دیکھیں تو علیحدگی کا سب سے بڑا سبب ان میں مشرقی پاکستان کی معاشی محرومیاں ہیں۔ یہ بات درست بھی ہے کہ اس عدم مساوات کو دور کرنے کیلئے کھلے دل سے کوشش نہیں کی گئی لیکن مشرقی پاکستان والوں نے بھی آزادی کے حوالے سے یہ توقعات پیدا کر لیں تھیں کہ ان کی معاشی محرومیاں فوری طور پر ختم ہو جائیں گی ظاہر ہے کہ فوری طور پر نتائج برآمد ہونا ممکن نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان کی 80 فیصد دولت آزادی کے وقت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اکثر شہری علاقوں میں جائیداد اور عمارات غیر مسلم ملکیت میں تھیں مشرقی پاکستان کے تیرہ سو نجی ہائی سکول اور 47 نجی کالجوں میں سے 95 فیصد ہندوؤں کی ملکیت تھے۔ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ پٹ سن تھی اس کا معیشت میں کل حصہ 60 سے 70 فیصد تھا اس زرمبادلہ کا بڑا حصہ مغربی پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ صنعتی سرمایہ کاری مشرقی پاکستان میں بہت کم اور مغربی پاکستان میں خصوصاً کراچی میں بہت زیادہ تھی۔ 1958ء میں پورے مشرقی پاکستان میں 148 کروڑ روپے کا صنعتی سرمایہ لگایا ہوا تھا جبکہ اکیلے کراچی میں سرمایہ 114 کروڑ سے زیادہ بنتا تھا اور اگر کراچی کو باقی مغربی پاکستان کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو یہ سرمایہ 308 کروڑ روپیہ بنتا ہے یعنی مشرقی پاکستان کے دوگنے سے بھی زیادہ۔ مشرقی پاکستان کی صنعتی سرمایہ کاری مغربی پاکستان کے

مقابلے میں صرف ایک چوتھائی تھی جو اپنے بجٹ کا چھپن فیصد حصہ دفاع پر خرچ کرنے جا رہا تھا۔ ٹیکس مشرقی پاکستان سے بھی وصول کیے جاتے تھے لیکن اس بجٹ کا دس فیصد بھی وہاں استعمال نہیں ہوتا تھا انگریزوں کا خیال تھا کہ بنگالی نسلاً اچھے فوجی نہیں بن سکتے۔ یہی پالیسی پاکستان نے بھی اپنائی۔ انہیں مارشل ریس نہیں سمجھا جاتا تھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ 1970ء تک صرف ایک بنگالی میجر جنرل کے عہدے تک پہنچا۔

عبدالودود گویاں معروف بنگالی دانشور اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ 1969ء تک پاکستانی افواج میں مشرقی پاکستان کا حصہ آٹھ فیصد سے زیادہ نہیں تھا پھر فضائیہ میں 1/3 تک پہنچ گیا تھا وہاں 1965ء کی جنگ میں ایم ایم عالم جیسے بنگالی قومی ہیروز نے اپنی جنگی قابلیت سے یہ بات غلط ثابت کردی کہ بنگالی اچھے فوجی نہیں بن سکتے۔ عبدالودود گویاں مزید لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے دریائی ڈیم مغربی پاکستان میں تعمیر ہوتے رہے اور مشرقی پاکستان میں سیلاب آتے رہے۔ یہ ڈیم جس زرمبادلہ سے تعمیر ہوتے رہے اس کا بہت بڑا حصہ مشرقی پاکستان سے حاصل کیا جاتا رہا چنانچہ وسائل مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آتے رہے اور بہت سا سرمایہ غیر قانونی طور پر بھارت بھی جاتا رہا جس کا کوئی حساب ہی نہیں مشرقی پاکستان کمزور ہوتا گیا اور یہیں سے معاملات بگڑے جن کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔

سانحے اور واقعے قوموں کو جگانے کیلئے آتے رہتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں بعض انتہائی عبرت ناک لمحات بھی شامل ہیں اور ان کی تکرار سے دو باتیں ثابت ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قوموں کے عروج و زوال یا بلندی و پستی یا عزت و ذلت کے بارے میں قرآن مجید میں جو قوانین بیان ہوئے ہیں وہ اٹل ہیں اور ان قوانین کے اطلاق میں قدرت یہود و نصاریٰ اور مسلم قوم کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ قانون قدرت

سب کیلئے یکساں ہے۔ دوسرا یہ پتا چلتا ہے کہ شاید قدرت اب تک مسلمانوں سے مایوس نہیں ہوئی۔ سقوطِ غرناطہ ہو سقوطِ ڈھاکہ ہو یا سقوطِ بغداد ہر بڑا صدمہ ملت اسلامیہ کو جھنجھوڑنے اور خواب غفلت سے جگانے کیلئے رونما ہوتا رہا۔ اگر قدرت اس قوم سے مایوس ہو چکی ہوتی تو بار بار یہ جھٹکے نہ لگائے جاتے۔ میڈیکل سائنس بھی یہ کہتی ہے اور بے حس عضو کو بحال کرنے کیلئے برقی جھٹکے اسی اصول کے تحت لگائے جاتے ہیں۔ اگر یہ خراب اور ناکارہ ہو جائے پھر اسے کاٹنے کی ضرورت پڑتی ہے یقیناً یہ نوبت ابھی تک نہیں آئی ورنہ اب تک ہم بھی قوم عاد قوم ثمود قوم نوح، یا قوم لوط کی فہرست میں جا چکے ہوتے لیکن یہ اطمینان کی بات نہیں کیونکہ تمام شواہد ظاہر کر رہے ہیں کہ رب تعالیٰ ہم سے راضی ہرگز نہیں ہے۔ مسلمان ہر طرف ذلت و خواری میں مبتلا ہیں، کشمیر، چیچنیا، افغانستان عراق، ہندوستان، فلسطین ہر گوشے میں مسلمان ہی کا خون بہہ رہا ہے یہ الگ بات کہ فسادات خانہ جنگی برادر کشی، غداری، ہر جگہ قدرت کی طرف سے سزا کی مختلف صورتیں ہیں۔ ہم اس واقعہ کی بات کر رہے ہیں جس کے لگائے ہوئے زخموں سے آج بھی خون ٹپک رہا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد اجتماعی اصلاح کی جس تحریک کی ضرورت تھی وہ چند روز ماتم کے بعد کیا ہم نے شروع کر دی اور کیا کوئی بھی سبق حاصل کرنے کی کوشش کی؟ سقوط ڈھاکہ کے بعد 21 دسمبر 1971ء کی صبح عوام کراچی کی سڑکوں پر نکل آئے ان کا مطالبہ تھا کہ پاکستان کی تقسیم کے ذمہ داران کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ لاہور، راولپنڈی اور فیصل آباد میں جلوس اور مظاہرے شروع ہو گئے اور جب اس مطالبے نے زور پکڑا کہ مجرموں کو سر عام پھانسی دی جائے تو تب کے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ اگر لوگ مقدمہ ہی چاہتے ہیں تو میں احتساب کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ چنانچہ جسٹس حمود الرحمان کی سربراہی میں کمیشن قائم ہوا جس میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس

انوار الحق اور سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس عبدالرحمان بھی شامل تھے۔ 31 دسمبر کے روز پہلا اجلاس لاہور میں ہوا۔ 15 جنوری 1972ء سے اس کمیشن نے بعض فوجی جوانوں سے ملاقات کر کے حالات و واقعات اور شکست کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کمیشن مختلف سیکٹرز کا دورہ کرنا چاہتا تھا مگر انہیں منع کر دیا گیا پھر 17 جنوری 1972ء سے راولپنڈی میں اس نے کارروائی کا باضابطہ آغاز کیا۔ حمود الرحمان کا بنیادی مقصد ان حالات کی تحقیق و تفتیش کرنا تھا جن کی وجہ سے مشرقی کمان کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اے کے نیازی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ 20 جنوری 1972ء کو 14 بڑی سیاسی جماعتوں کو خصوصی مراسلے بھیجے گئے اور ان کو کہا گیا کہ وہ کمیشن کے سامنے آ کر اپنے بیان ریکارڈ کروائیں۔ 21 جنوری 1972ء کو حمود الرحمان کمیشن نے کہا کہ اگر حکومت ان پر اپنا نمائندہ مقرر کرنا چاہے تو کرے جس پر یحییٰ خان کو مقرر کیا گیا۔

حمود الرحمان کمیشن نے اپنی پہلی رپورٹ جولائی میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان بیشتر افراد کی شہادت حاصل نہیں ہو سکی جو جنگی قیدی بنائے گئے تھے ہم قیدیوں کی واپسی کے بعد دوبارہ کارروائی شروع کریں گے۔ کمیشن نے 72 جنگی قیدیوں اور 17 سیاسی جماعتوں حکومت اور مسلح افواج کے نمائندہ سمیت 216 سے زائد گواہوں کے بیانات 7 ماہ کے اندر اندر قلم بند کیے۔ کئی عوامل کا جائزہ لیا اور 452 صفحوں پر مشتمل رپورٹ کو 8 جولائی 1972ء حکومت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ بھٹو مرحوم نے اس کا مطالعہ کر کے ٹاپ سیکرٹ قرار دیا اور سخت حفاظتی مقام پر رکھ دیا۔

یہ خبر اس دور میں عام ہوگئی کہ جن 39 صفحات میں بھٹو مرحوم کا تذکرہ تھا تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ معروف صحافی حبیب اللہ نے دعویٰ کیا کہ کمیشن کے سیکرٹری ایم اے لطیف کو وزیر اعظم ہاؤس بلا کر کہا گیا کہ وہ عبوری رپورٹ کے ہر صفحے پر دستخط کر دیں تا کہ رپورٹ کے

مستند ہونے کی تصدیق ہو جائے وہ ہر صفحہ پر دستخط کرتے رہے مگر جب تبدیل شدہ صفحات پر پہنچے تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے تبدیل شدہ صفحات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور وہاں سے باہر نکل آئے۔

1974ء میں بھارت کی قید سے واپس آنے والوں کو موقع دیا گیا کہ وہ کمیشن کے روبرو پھر پیش ہو کر بیانات قلمبند کروائیں اور معلومات فراہم کریں پھر دوسرے مرحلہ میں 72 افراد نے بیانات ریکارڈ کروائے جن میں مشرقی پاکستان کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اے کے نیازی، راؤ فرمان علی اور میجر جنرل جمشید وغیرہ شامل تھے۔ میجر جنرل رحیم کا بیان دو مرتبہ لیا گیا اس طرح رپورٹ کا یہ حصہ 23 دسمبر کو پورا ہو گیا اس کے بعد ضیاء الحق، نواز شریف، بے نظیر بھٹو آئیں مگر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ 13 اگست 2000ء کو ایک بھارتی صحافی نے ہندو اخبار میں اس رپورٹ کے کچھ حصے شائع کئے تو دسمبر 2000ء میں جنرل پرویز مشرف نے اس رپورٹ کو کھولنے کا حکم دیا۔ جو رپورٹ شائع ہوئی اس پر سربراہ یا اراکین کے دستخط نہیں تھے کیبنٹ ڈویژن نے وضاحت کی کہ کمیشن پر فوجی ممبران کے دستخط موجود ہیں جو رپورٹ پیش کی گئی ان میں جنرل یحیٰی جنرل مٹھا وغیرہ پر ساری ذمہ داری ڈالی گئی، ان میں سے جنرل یحیٰی 9 اگست 1980ء کو انتقال کر گئے۔ جنرل گل حسن بعد میں بھٹو حکومت میں چیف آف آرمی سٹاف رہے اور 9 اکتوبر 1989ء کو انتقال کر گئے۔ میجر جنرل رحیم خان چیف آف جنرل سٹاف رہے۔ سویلین عہدوں میں وہ وفاقی سیکرٹری بھی رہے اور جنرل ضیاء کے دور میں پی آئی اے کے چیئرمین بھی رہے۔ حمود الرحمان کمیشن نے ان کے کورٹ مارشل کی سفارش کی تھی کمیشن نے ایسٹرن کمانڈ کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل نیازی کے بارے میں کہا کہ وہ پان کی سمگلنگ میں بھی ملوث تھے۔ ان کے بھی کورٹ مارشل کی سفارش کی گئی تھی۔ میں اس خیال پر دھیان رکھ رہا ہوں کہ میں کوئی منصف نہیں ہوں

عدل وانصاف کرنا میرا کام نہیں۔ میں خود کتابوں کا بوجھ اپنے سر پر لاد چکا ہوں۔ جس نے اِس جہاں میں جو کچھ کیا اُس کا صلہ یہیں پالیا اور باقی اُس جہاں میں یقیناً بے لاگ احتساب ان کا منتظر ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہوا کرتے ہیں جنہیں غلطیوں کے ارتکاب کے بعد توبہ کی مہلت مل جائے معافی کی گھڑیاں نصیب ہو جائیں اور ندامت کے چند آنسوؤں کے بہانے کا وقت نصیب ہو جائے۔ ہمیں چاہئے کہ جو کچھ ہمارے پاس باقی بچا ہے اس کا خیال رکھیں حفاظت کریں کیونکہ یہ ملک ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے۔ آمین۔

19 دسمبر 2003ء

ازبک تحریک اور القاعدہ

صدر مشرف کے سی این این کو دیے گئے انٹرویو میں ایک ہائی ویلیو ٹارگٹ کا تذکرہ ہوتے ہی دنیا بھر کے میڈیا میں ڈاکٹر ایمن الظواہری کے جنوبی وزیرستان میں گھیر لیے جانے کی اطلاعات اور ان کے تبصروں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد قندھار سے طالبان کے ترجمان عبدالصمد نے سیٹلائٹ فون پر بیان دیا کہ ایمن الظواہری کے گھیرے میں لئے جانے کی اطلاعات طالبان کے حوصلے پست کرنے کیلئے پھیلائی جا رہی ہیں اور پشاور میں طالبان کے قریب ترین ذرائع نے کہا کہ اسامہ اور ایمن دونوں ایک طویل عرصے سے اس علاقے سے جا چکے ہیں۔ افغانستان میں جب امریکہ نواز کرزئی حکومت کے محکمہ دفاع کے جنرل عتیق اللہ لڈن نے یہ بیان دیا کہ القاعدہ یا طالبان اب افغان سرحد پر قدم نہیں رکھ سکتے اس وقت جنوبی وزیرستان سے بڑی تعداد میں جنگجو افغانستان کے صوبہ پکتیا میں پہنچ چکے تھے۔ جنوبی وزیرستان میں پاک افواج اور جنگجوؤں کے درمیان چھڑنے والی جھڑپ سے صرف 25 کلومیٹر مغرب میں امریکی پکتیا کے ایک گاؤں میں ایک انتہائی بڑے فوجی اڈے کے ساتھ موجود ہیں اور وہاں صرف امریکی افواج ہی نہیں بلکہ CIA اور کمانڈو 121 سمیت

سپیشل فورسز کے دیگر دستے بھی موجود ہیں۔ یہ اڈا پاک فوج کو سیٹلائٹ پیغام اور دیگر طریقوں سے اکٹھے کیئے گئے انٹیلی جنس ڈیٹا سے آگاہ کر رہا ہے چنانچہ ہائی ویلیو ٹارگٹ اگر صدر مشرف کے بقول اسامہ یا ایمن الظواہری نہیں تھا تو پھر کون تھا جس کا صدر مشرف نے اندازہ لگایا تھا۔

ڈاکٹر ایمن الظواہری سمیت دیگر اہم رہنما تو وہاں چند ماہ پہلے آپریشن فلڈ اسپنیسو کا ذکر سن کے وہاں سے ہل ہی نہیں سکے تھے اس لئے غالباً قوی امکان یہ ہے کہ جس ہائی ویلیو ٹارگٹ کا ذکر صدر مشرف نے کیا یہ ایمن الظواہری نہیں بلکہ ازبکستان کے اسلامی تحریک کے قائد طاہر یلدے شیف ہیں جنہوں نے نومبر 2001ء میں جمعہ نعمان غنی کی امریکی بمباری کے نتیجے میں شہید ہو جانے کے بعد اس تنظیم کی قیادت سنبھال لی۔ اس تنظیم کا قیام 1990ء میں ازبکستان کی وادی فرغانہ میں نعمان گنج کے ایک چھوٹے سے علاقے میں سعودی مالی امداد اور پانچ ہزار ساتھیوں کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں ایک مسجد تعمیر کر کے اس کی دیوار پر اسلامی ریاست زندہ باد لکھ کر ازبکستان کے صدر سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ازبکستان کو اسلامی ریاست قرار دے دیں۔ یہ تنظیم عدالت پارٹی کے نام سے کام کر رہی ہے اور اس کے اولین قائد نعمان غنی جمعہ کے علاوہ طاہر یلدے شیف بھی تھے جو 1992ء میں وہاں عدالت پارٹی پر پابندی لگنے کے بعد تاجکستان فرار ہو گئے۔ ان کا وہاں کسی اسلامی تحریک سے بھی رابطہ ہو گیا اس کے بعد یلدے شیف اور نعمان غنی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پاکستان ،ایران، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے دورے کرتے رہے اور اس دوران 1995ء سے لے کر 1998ء تک ان کی تحریک کا مرکز پشاور رہا جہاں ISI جو افغان جنگ کے بعد طالبان کی حمایت کر رہی تھی ان سے مسلسل رابطے میں رہی ہے۔ یہیں پر یلدے شیف اور نعمان غنی جمعہ کی ملاقاتیں ان عرب افغانوں سے ہوئیں جو اسامہ بن لادن کے

ساتھ سویت یونین میں جہاد کیلئے آئے تھے اور بعد میں یہیں بس گئے تھے۔ انہیں عربوں کی وساطت سے ان عربوں اور تاجک نوجوانوں کی ملاقاتیں، اسامہ بن لادن اور دوسرے افغان گروپ سے بھی ہوئیں اور 1996ء میں پشاور سے لے کر کراچی تک ان ہزاروں مدرسوں میں خصوصی تعلیم کے ساتھ ان وسطی ایشیاء کے طلباء کو مذہبی تعلیم دی جا رہی تھی۔ سعودی عرب کے نزدیک ازبک کا صدر ایک ناقابلِ اصلاح کمیونسٹ تھا اس لئے ان نوجوانوں کا براہ راست سعودی خفیہ اداروں کے سربراہ شہزادہ فیصل تک سے رابطہ تھا اور ازبک اسلامی تحریک کو وہاں سے گرانقدر مالی امداد بھی ملا کرتی تھی۔

1993ء میں ان نوجوانوں نے ابوالعباد نامی درے میں ایک بڑی جنگ شروع کی اور افغانستان میں موجود عربوں کو اس سے بہت متاثر کیا جو کہ اس جنگ کو وسطی ایشیا میں ایک ایسے عظیم جہاد کا آغاز سمجھ رہے تھے جو سابق سویت یونین کے عین وسط میں اسلامی انقلاب کو جنم دینے والا ہے۔ یہ ازبک نوجوان اپنے قائدین کے ساتھ بھرپور وفاداری اور سخت نظم وضبط کے قائل تھے۔ اسی دوران 1997ء میں تاجکستان میں خانہ جنگی کا خاتمہ ہوگیا۔ نعمان غنی جمعہ اور دیگر ازبک کمانڈروں نے اس امن معاہدے کی مخالفت کی تاہم انہوں نے اپنے زیادہ تر دستوں کو منتشر کر دیا اور ایک مخصوص گروپ اور چند گوریلوں کے ساتھ کرغیض سرحد کے قریب ایک سڑک کے کنارے فارم میں اپنی بیوی بچوں اور تقریباً 40 ازبکوں اور چند عربوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نعمان غنی جمعہ کا یہ فارم جلد ہی اسلامی انقلابیوں کا ایک مرکز بن گیا اور وہاں ازبک، عرب، چیچن اور تاجک مجاہدین کی خوب مہمان نوازی کی جاتی رہی۔ 1999ء میں نعمان غنی جمعہ اور دیگر ازبک گوریلوں کے افغانستان جاتے ہوئے اس فارم پر 200 کے قریب افراد رہتے رہے اور ان میں زیادہ تر بیوی بچول کے ساتھ رہتے تھے۔

ازبکستان کے حالات بدتر ہوتے چلے گئے۔ وہاں کی حکومت اور سیکورٹی فورسز اسلام پسندی کی ان تحریکوں کو کچلنے کی پالیسی پر سختی سے عمل کررہی تھیں اگست 95ء میں اندلی جان کے امام اعظم کو ان کے معاون سمیت قید کرکے شہید کردیا گیا پھر مارچ 98ء میں تخت بھائی اپنے ماں باپ اور بچوں سمیت غائب ہوگیا ہر داڑھی رکھنے والے شخص کی زندگی وہاں پر مشکل بنادی گئی اور صدر قائیموف نے دومئی 1998ء کو ازبک پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں کے سروں میں گولی مارنی چاہیے اور اگر ضروری ہوا تو میں خود انہیں گولیاں ماروں گا۔ جہادیوں کے ٹھکانے بھی اس کریک ڈاؤن کا حصہ بنے اور تنظیم کے قائد یلدے شیف کی والدہ نے 1999ء میں ازبک میڈیا پر آکر کہا کہ میں ازبک صدر اور عوام سے بے پناہ شرمندہ ہوں۔ کاش زمین پھٹ جائے اور میرا بیٹا اس میں غرق ہوجائے۔ نعمان غنی جمعہ کی بہن اور بھائی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی اگست 1999ء میں نعمان غنی کی والدہ کو ایک اجتماع عام میں بلایا گیا اور ازبک اسلامی تحریک سے لڑتے ہوئے مارے جانے والے جو مقامی ازبک فوجی تھے ان کے رشتہ داروں اور ان کے اپنے پڑوسیوں کے ہاتھوں سر عام اس کا منہ کالا کرایا گیا اور نعمان غنی کو جنم دینے پر اس عورت پر پورے مجمعے نے لعنت بھیجی۔ شہر کے وسط میں ہونے والے لاکھوں افراد کے ہجوم سے نعمان غنی کی ماں روتے ہوئے معافی مانگتی رہی اور اپنے بیٹے پر لعن طعن کرتی رہی۔ جوابی مقابلے کیلئے نعمان غنی اور یلدے شیف سمیت دیگر ازبک جہادیوں پر اب دباؤ بڑھنے لگا لیکن پہلے انہیں مناسب پناہ گاہ چاہیے تھی چنانچہ یہ دونوں شخصیات افغانستان آگئیں۔ ازبک صدر چونکہ شمالی اتحاد کی مدد کررہا تھا چنانچہ اسامہ بن لادن اور طالبان نے ان کی بھرپور مدد کا فیصلہ کیا اور یہ دونوں حضرات اسامہ بن لادن کا وسطی ایشیا میں پہلا رابطہ تھے۔ 1998ء میں ازبک صدر کو کابل میں وزیر خزانہ کے سفارتی علاقے میں لے جایا گیا اور اسی موسم گرم میں نعمان غنی اور یلدے

شیف نے کابل میں ازبک اسلامی تحریک کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے ایک طویل انٹرویو میں اپنے ظالم حکمرانوں کے خلاف اعلان جہاد کردیا۔ پوری دنیا کی صورتحال گیارہ ستمبر کے بعد تبدیل ہوگئی اور اہم جیوسٹریٹجک تبدیلیاں وسطی ایشیا میں امریکہ کے ہاتھوں آنے لگیں۔ واشنگٹن کو طالبان پر حملہ آور ہونے کیلئے ازبکستان میں فوجی اڈے درکار ہوئے۔ ازبکستان نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے امریکی فوجیوں کو اڈے دینے کے علاوہ ازبک سرزمین سے جنگی کارروائیوں کی اجازت بھی دے دی جبکہ طالبان مخالف شمالی اتحاد کو اسلحہ فراہم کرنے کیلئے روس، ایران اور ترکی کو بھی اپنی سرزمین دینی پڑی۔ 19 اکتوبر 2001ء کو ایک ریڈیو انٹرویو میں یلدے شیف نے کہا کہ ہم امریکی حملوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے طالبان کے کاندھے سے کاندھے ملا کر لڑیں گے۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں نے شدید احتجاج کیا کہ امریکہ وسطی ایشیا میں اپنے نئے اتحادیوں کو استعمال کرنے کیلئے خصوصاً ازبکستان میں وسیع تر جمہوری اور انسانی حقوق کے احترام کے مطالبات نظرانداز کررہا ہے اور اس کے بعد ایسا ہی ہوا۔ اسلامی تحریک یا ازبک تحریک والوں کے سر پر القاعدہ کے نام کے تمام ذرائع تھوپے جانے لگے۔

24 مارچ 2004

خودکُش حملے اور ایف بی آئی کا دائرۂ کار

نامزد وزیراعظم شوکت عزیز اپنی انتخابی مہم کے دوران ایک قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے ہیں لیکن ان کے ڈرائیور اور خودکش حملہ آور سمیت چھ افراد کے مارے جانے کی اطلاعات ہیں۔ یہ 16 اپریل کو کورکمانڈر کراچی اور اس سے پہلے 25 دسمبر کو صدر جنرل پرویز مشرف پر ہونے والے حملوں کے بعد کسی اہم ترین سرکاری شخصیت پر ہونے والا بڑا حملہ ہے۔ کورکمانڈر پر حملے میں 9 جبکہ صدر مشرف پر حملے میں 16 افراد مارے گئے تھے۔ صدر مشرف پر حملے کے سلسلے میں اسلام آباد پولیس کی اسپیشل برانچ کے محمد نعیم کو گرفتار کیا گیا تھا جس کے موبائل فون پر اس محمد جمیل کے فون کالز خودکش حملے سے کچھ دیر پہلے موصول ہوئی تھی جو آزاد کشمیر کے علاقے بالاکوٹ سے تعلق رکھنے والے 2 میں سے ایک خودکش حملہ آور تھا۔ محمد نعیم کی ڈیوٹی غالباً اس کنونشن سنٹر پر تھی جہاں صدر مشرف ایک تقریب کی صدارت کو گئے۔ محمد نعیم نے وہیں سے خودکش حملہ آور محمد جمیل کو صدر کے قافلے کی حتمی جگہ سے آگاہ کیا تھا۔ دوسرا خودکش حملہ آور محمد سلطان تھا جس کا تعلق بھی آزاد کشمیر کے پونچھ کے علاقے سے

تھا۔ یہ دونوں خودکش حملہ آور 11 ستمبر کے بعد افغانستان میں تھے جہاں پر شمالی اتحاد کی فوج کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد رہا ہو کر پاکستان آئے تھے۔

25 دسمبر کو صدر پر حملے سے پہلے 23 سالہ محمد جمیل نے اپنے موبائل فون پر کم سے کم 109 فون کالز کیں تھیں۔ غالباً وہ آزادانہ گفتگو اس لیے کرتا رہا کہ اسے یقین تھا کہ خودکش حملے کے ساتھ ہی یہ تمام شناختی نشانیاں بھی ختم ہو جائیں گی لیکن قاتلانہ حملے میں ناکامی کے ساتھ ساتھ اس کے موبائل فون کا میمری کارڈ بھی ضائع ہونے سے بچ گیا۔ اس سے پہلے 14 دسمبر کو صدر مشرف کی گاڑیوں کا قافلہ راولپنڈی کے ایک پل سے گزرنے کے 55 سیکنڈ بعد ساڑھے پانچ سو پاؤنڈ طاقتور ترین سی فور دھماکہ خیز مواد سے اس پل کو اڑا دیا گیا تھا۔ صدر کو اس حملے سے محفوظ رکھنے میں اہم ترین کردار وی آئی پی ٹو فوم رینجرز نامی اس حساس آلہ نے کیا تھا جو ریموٹ کنٹرول ڈیوائسز کو بلاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شوکت عزیز پر حملے کے باعث اب اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ عوامی اجتماعات میں ان کے جانے اور انتخابی مہم کے جلسے جلوسوں میں انکی شرکت انتہائی مشکل ہوگی اس واقع سے پہلے کل ملک بھر میں عراق اور اسلامی ممالک کی افواج بھیجے جانے کی سعودی تجویز اور عراق میں دو پاکستانیوں کے قتل کے معاملات پر بحث ہوتی رہی جبکہ اس واقع سے پہلے کل امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے وزیر داخلہ فیصل صالح حیات کے اس بیان کی تصدیق کر دی جس کے مطابق 26 جولائی کو گجرات کے علاقے اسلام پورہ میں چوبیس گھنٹے طویل مقابلے کے بعد گرفتار ہونے والے 13 افراد میں سے ایک زنجبار میں پیدا ہونے والا تنزانیہ کا باشندہ احمد خلفان ہے جو امریکن ایف بی آئی کو 7 اگست 1998ء کو دارالسلام اور کینیا میں امریکی سفارتخانوں کے بم دھماکوں میں ملوث ہونے پر مطلوب ہے۔ اس شخص کی گرفتاری پر ایف بی آئی نے 5 ملین ڈالرز کا انعام مقرر کر رکھا تھا اور اسے نیویارک کے

ڈسٹرکٹ کورٹ میں 16 دسمبر 1998ء کو اس جرم میں مرتکب قرار دیا گیا تھا۔ احمد خلفان کے ساتھ اس کی ازبک بیوی کی گرفتاری بھی ظاہر کی گئی ہے۔ گرفتار ہونے والے دیگر افراد کا تعلق کینیا، سوڈان اور جنوبی افریقہ اور ایک اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والا پاکستانی بتایا جارہا ہے جبکہ ان میں سے ایک افغان عورت اور ایک 12 سالہ سعودی بچی کی گرفتاری کی بھی اطلاعات ہیں۔ اس گرفتاری کا اعلان حکومت سندھ کی جانب سے کراچی میں اس ہائی الرٹ کے اعلان کے ساتھ آیا جس میں باوثوق ذرائع کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ آج مختلف مساجد میں نماز جمعہ کے دوران دہشت گرد خودکش حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں شہر کے جنوبی حصے میں امریکن قونصل خانے کو جانے والے تمام راستے بند تھے اور اہم تنصیبات پر ہیلی کاپٹر پرواز کرتے نظر آرہے تھے۔ ایک حساس ادارے کے ذرائع نے یہ بھی بتایا کہ ایک بینک آفیسر کی صاحبزادیاں جن کے نام عارفہ اور صبا ہیں مختلف مقامات پر خودکش حملوں کی تیاریاں کر رہی ہیں گرفتاریوں اور ہائی الرٹ کی اطلاعات کے باوجود عراق میں دو پاکستانیوں کے مبینہ قتل اور اس کے دوران سعودی عرب کی طرف سے وہاں ایک اسلامی فوج بھیجے جانے کی تجویز پر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہمارے ارباب اختیار اور عوام دونوں کے درمیان اہم ترین موضوع بحث رہی اور یہ تمام واقعات کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے مربوط بھی ہیں۔ ویب سائٹ پر جماعت الوحید عمر مختیار بریگیڈ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ ہر اس مسلم یا عرب ملک کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں گے جو عراق میں اپنی فوج بھیجنے پر آمادگی کا اظہار کریں گے۔ عمر مختیار لیبیا کا وہ حریت پسند تھا جسے اطالوی قبضے کے خلاف لڑتے ہوئے 1931ء میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ ان دھمکیوں اور شوکت عزیز پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد اہم ترین شخصیات کی نقل و حرکت محدود اور بیشتر سرکاری تقریبات ملتوی کی جارہی ہیں۔

کراچی میں ایک سرکاری عہدے دار کو کور کمانڈر پر حملے کے سلسلے میں زیر حراست لیے جانے کی اطلاعات اور اسے راولپنڈی بھیجے جانے کی بھی خبریں ہیں۔ القاعدہ کے مبینہ رکن کی گجرات سے گرفتاری حساس اداروں کی معلومات پر کی گئی جنہیں اس قسم کے آپریشن میں غیر ملکی اداروں کی بھرپور انٹیلی جنس معلومات بھی فراہم کی جارہی ہیں۔ ہمارے ہاں یوں تو ایف بی آئی کے بارے میں بہت کچھ منظر عام پر آتا رہا ہے۔ لیکن ایسی مصدقہ معلومات کبھی سامنے نہیں آئیں جو پاکستان میں ایف بی آئی کے دفاتر کی موجودگی کو ثابت کر سکے۔ چند روز پہلے سابق وزیر داخلہ معین الدین حیدر کے ایف بی آئی کے پاکستان میں کارندوں کی موجودگی کے اعتراف کے علاوہ خود ایف بی آئی اپنی خفیہ دستاویزات میں باقاعدہ اعتراف کرتی ہے کہ 11 ستمبر 2001 سے پہلے اس کا مستقل دفتر پاکستان میں قائم ہو چکا تھا۔ 1995ء میں ہی کراچی کے عبداللہ ہارون روڈ پر کئی وسیع و عریض بنگلے امریکن قونصل خانے نے دس سالہ لیز پر حاصل کر لیئے تھے اور اس کے بعد کئی ایسے واقعات رونما ہوئے کہ ایف بی آئی کو باقاعدہ پاکستان آکر اپنی سرگرمیاں جاری کرنے کا موقع مل گیا۔ مثلاً مارچ 1995ء میں کراچی میں جب امریکی قونصل خانے کی گاڑی پر فائرنگ کے نتیجے میں دو امریکی ہلاک ہوئے تو ایف بی آئی کی 15 ٹیمیں انتہائی عجلت میں کراچی پہنچیں جن میں طبی ماہرین بھی شامل تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنے اہلکاروں کا پوسٹ مارٹم کیا اور تمام تحقیقات بھی انہیں کی نگرانی میں ہوئیں تھیں۔ پھر نومبر 1995ء میں ہی اسلام آباد میں جب مصر کے سفارت خانے میں بم دھماکہ ہوا تو اسکی تحقیقات کے لیے بھی ایف بی آئی کی ٹیم اسلام آباد پہنچی۔ یہ بات بہت سوں کے لیے حیران کن تھی کہ آخر مصر کے سفارت خانے کے بم دھماکے سے ایف بی آئی کا کیا تعلق ہے۔ ایک حساس ادارے کے ذرائع نے اس سلسلے میں دلچسپ انکشاف کیا تھا کہ وہ دھماکہ دراصل مصری حکومت نے خود کروایا تھا تا کہ مصر کی ایک مذہبی جماعت پر

اس کی ذمہ داری ڈال کے اس کے خلاف کاروائی ہو سکے اور پاکستان میں ایف بی آئی کی موجودگی کا جواز پیدا کیا جا سکے لیکن 1995ء کے بعد یہ سرگرمیاں عارضی بنیادوں پر تھیں اور کسی بھی مشن کے مکمل ہونے کے بعد مستقل طور پر ان ایجنٹس کو یہاں تعینات نہیں کیا جاتا تھا لیکن ایف بی آئی کے انوسٹی گیشن سروسز کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل جمیز ویبر نے 23 مارچ 2000ء کو وزارت قانون کی کمیٹی کے سامنے جو تحریری بیان پیش کیا اس میں ان تمام ممالک کی فہرست شامل تھی جہاں سنہ 2000ء کے مالی سال میں ایف بی آئی کے دفاتر قائم کر کے اسپیشل ایجنٹس بھیجے جانے تھے۔ اس فہرست میں پاکستان بھی شامل تھا۔ جمیز ویبر کے بیان کے بعد 1996ء میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ایف بی آئی کے ایجنٹس کو امریکی سفارت خانوں میں لیگل اتاشی کے طور پر بھیجا جائے گا۔ اور اس طرح امریکی سفارت خانوں میں 7 سینئر اسپیشل ایجنٹس کا تقرر کیا گیا تھا جن کے 23 مما لک میں 54 معاون اہلکار بھی بھرتی کیے گئے۔ ان ایجنٹس کی ذمہ داریاں ان مما لک کی متعلقہ اتھارٹیز کے تعاون سے جرائم کو کم کرنے کے علاوہ وہاں امریکیوں کے تحفظ کو یقینی بنانا بھی تھا۔

ایف بی آئی نے 27 جنوری 2003ء کو جاری ہونے والی ایک دستاویز میں ان ملکوں کی فہرست دی ہے جہاں لیگل اتاشی اور ڈپٹی لیگل اتاشی کے سفارتی کوڈ کے تحت ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹس کام کرتے ہیں۔ اس میں پاکستان بھی ہے اور رابطے کیلئے باقاعدہ اسلام آباد کا ٹیلی فون نمبر 2080000 بھی دیا گیا ہے جو کہ امریکی سفارت خانے کا نمبر ہے۔ اکتوبر 2002ء کے وسط میں امریکہ کے ایک سرکاری عہدے دار نے واشنگٹن میں ایک سپائیڈر گروپ کی تشکیل کا انکشاف بھی کیا تھا جس میں اکثریت چند ریٹائرڈ افسران کی تھی اور جن کی ذمہ داری قبائلی علاقہ جات اور پاک افغان سرحد پر طالبان اور القاعدہ کے اراکین کی تلاش میں ایف بی آئی کی مدد کرنا تھی۔ اس سپائیڈر گروپ کا ایک مقصد یہ بھی تھا

کہ طالبان سے متعلق سرگرمیاں امریکہ کو بغیر کسی تعطل کے ملتی رہیں اور اس میں چند بریگیڈئر اور کرنل رینک کے ان ریٹائرڈ افسران کی خدمات حاصل کی گئیں جو 80ء کی دہائی میں روس کے خلاف افغان جہاد کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ افراد کو مدارس مساجد اور دیگر مذہبی جماعتوں پر نظر رکھنے کی ذمہ داریاں بھی دی گئیں تھی۔ اس سپائیڈر گروپ نے قبائلی علاقوں میں اپنے نیٹ ورکس کو مضبوط بنانے کے لئے بہت سے مقامی افراد کو بھرتی بھی کیا اور انہیں جدید ساز و سامان بھی مہیا کیا لیکن جلد ہی سپائیڈر گروپ خود ہمارے حساس اداروں کی نگرانی میں آ گیا اور ان کی سرگرمیاں محدود کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ قبائلی علاقوں میں ایف بی آئی سے تعاون کے پاداش میں کئی مقامی افراد اس دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مثلاً ایک شخص رسول نامی اس الزام کے تحت مارا گیا جو خود کبھی طالبان کا ایک اہم رکن تھا۔ پھر ذی خیل قبیلے کے سید وزیر محمد، وانا بازار میں محمد علی اور زیمل کے علاقے میں رسول دین کو ایف بی آئی کیلئے کام کرنے کے الزام میں ہلاک کر دیا گیا لیکن اس دوران چند اہم القاعدہ رہنماؤں کی پاکستان سے گرفتاریاں بھی مقامی اداروں کے تعاون سے ایف بی آئی کی مدد سے عمل میں لائی گئیں۔ ان میں مارچ 2002ء میں فیصل آباد سے ابوزبیدہ اور مارچ 2002ء میں ہی کراچی سے رمیزی نبی شبعی اور مارچ 2003ء میں راولپنڈی سے خالد شیخ محمد جبکہ اس کے بعد اپریل 2003ء میں کراچی سے ولید نامی شخص زیرِ حراست لے لیا گیا۔ ان تمام گرفتاریوں کے باوجود ایف بی آئی کا دہشت گردوں کے خلاف اپنی جنگ میں پاکستان سے متعلق ایک طویل ایجنڈا ہے۔ امریکی حساس ادارے دعویٰ کرتے ہیں ان کی دستاویزات کے مطابق افغانستان پر امریکی بمباری کے بعد القاعدہ کے 500 میں سے کم سے کم چار سو اراکین سرحد عبور کر کے پاکستان داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں سے 75 فیصد یمن اور سعودی عرب نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ 30 کے قریب

بلوچستان کے رستے عراق پہنچ گئے تھے باقی 225 کے لگ بھگ اراکین پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، فاٹا اور آزاد کشمیر کی طرف نکل گئے تھے جبکہ 75 کے قریب کراچی کی طرف آ گئے تھے اور ان میں سے تقریباً 50 اب بھی وہاں موجود ہیں۔ امریکہ یہ بھی کہتا ہے کہ طالبان کی کل تعداد اکتوبر 2001ء سے پہلے تقریباً بیس ہزار تھی۔ ان میں سے تقریباً پانچ ہزار طالبان امریکی حملوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ 10 ہزار طالبان بشمول ملا عمر اور ان کے قریبی رفقاء اب بھی افغانستان میں موجود ہیں جبکہ پانچ ہزار طالبان پاکستان کی طرف آ گئے تھے۔

31 جولائی 2004ء

وانا آپریشن اور وطن عزیز پر اس کے اثرات

جنوبی وزیرستان میں جو کچھ ہوا اس کے اثرات اب وسطی ایشیاء تک محسوس کئے جا سکتے ہیں اور امریکی مخالف قوتوں کی ازبکستان میں پچھلے چند روز کے دوران بھرپور گوریلا کارروائیوں میں جن میں خودکش حملے اور فائرنگ کے واقعات تھے چالیس سے زیادہ افراد مارے گئے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ازبکستان میں خودکش حملے ہوئے ہیں اور وہاں کی انتظامیہ نے ان میں اسلامی تحریک کو ملوث کیا ہے۔جس کے سربراہ طاہر یلدے شیف کے بارے میں وزیرستان سے اطلاع تھی کہ وہ یہاں سے زخمی ہو کے فرار ہو گئے ہیں اور تاجک ذرائع کا اب یہ دعویٰ ہے کہ ان کی تنظیم نہ صرف وادی فرغانہ پر بھرپور حملے کی تیاری کر رہی ہے بلکہ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے پاس افغانستان میں اس تنظیم کے بانی جمعہ نعمان غنی کے 2001ء میں مارے جانے کی اطلاعات تھیں۔

دوسری جانب ان کے بارے میں بھی تردیدی اطلاعات ہیں اور وہ بھی اس علاقے میں زندہ موجود ہیں اور لڑنے والوں کی قیادت کر رہے ہیں اور انہیں منظّم کر رہے ہیں۔ 23 مارچ کو ازبک صدر نے اسلام آباد سے مطالبہ کیا تھا کہ وزیرستان سے گرفتار ہونے والے ازبک باشندوں کو ہمارے حوالے کیا جائے اور انہوں نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ طاہر یلدے شیف یا تو مر گیا ہے یا پھر زخمی ہے اور اس کی تنظیم اب مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اس کے فوراً بعد اس تنظیم نے اپنی بھرپور موجودگی کا اظہار وہاں کر دیا ہے حالیہ کارروائیوں

میں ازبک حکام نے پہلی مرتبہ حزب التحریر کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔حزب التحریر پر اس سے پہلے کبھی بھی کسی پُر تشدد کارروائی کا الزام نہیں لگایا گیا اور وہ خلافت کے قیام کیلئے وسطی ایشیاء کی ریاستوں میں تقریباً ایسے دس ہزار کارکنوں کے ساتھ سرگرم عمل ہے اور اس وقت ان کے پانچ سو کارکن پابندِ سلاسل ہیں۔اگرچہ حزب التحریر میں اکثریت ازبکوں کی ہے لیکن اب ان کی قوت چین کے مسلم اکثریتی صوبے زنکجینگ تک پھیل رہی ہے۔حزب التحریر نے دہشت گرد کارروائیوں میں اپنے ملوث کیئے جانے کی سختی سے تردید کی ہے۔وسطی ایشیاء کے ساتھ ساتھ اتحادی افواج کیلئے یہ اطلاعات بھی وزیرستان سے کسی طرح بھی خوش آئند نہیں۔ جہاں سے ان کو دو سو روز بعد ہونے والے امریکی الیکشن مہم کے دوران صدر بش کیلئے ایک اچھی اور بڑی اطلاع کی توقع تھی۔ یہاں سرحد کے اس پار 70 ہزار پاک فوج موجود ہے اور سرحد کے اُس پار 12 ہزار امریکی افواج میں دو ہزار کا مزید اضافہ ہونے والا ہے۔پینٹاگون ٹاسک فورس 121 بھی وہاں بھیج چکا ہے اور نیوی سیلرز بھی وہاں پر موجود ہیں۔فروری میں سی آئی اے کے چیف جارج ٹینٹ کے خاموش دورے کے بعد کئی یورپی وزرائے خارجہ اور پھر کولن پاؤل اور سنٹرل کمانڈ کے جنرل ابی زید بھی اسلام آباد آچکے ہیں اور دہشت گردوں کی تلاش میں زمین پر پیراملٹری دستے، ہیلی کاپٹر، ایئر کرافٹ بہت اوپر مطلوبہ افراد کو تلاش کرتے جاسوس سیٹلائٹ، بغیر پائلٹ کے ای 8 جیٹ اس کے علاوہ یوٹو سپائٹس میں اور موبائل ٹیلی فون ریکارڈ کرنے والا آرسی 135 ہے۔لیکن ہمارے دو ہزار چار سو تیس کلومیٹر طویل پاک افغان بارڈر پر متوقع اسپرنگ افینسو کا پہلا حصہ غیر متوقع صورتحال سے دوچار ہو رہا ہے۔

جنوبی وزیرستان کے بارہ روزہ فوجی آپریشن کا اختتام افسوس ناک واقعہ یعنی پہلے آٹھ اغوا کیئے گئے سرکاری اہلکاروں اور اس کے بعد دو مزید اہلکاروں کی لاشوں کی برآمدگی

سے اٹھا ہے جنہیں حراست میں ہلاک کرنے کے بعد کئی لاشیں کھائیوں میں اور کنوؤں میں پھینک دی گئی تھیں۔ بارہ اغواء کئے گئے سرکاری اہلکار رہا کئے گئے اور متعدد افراد جنہیں اس علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا وہ اس وقت سرکاری تحویل میں ہیں۔ حکومت کا موقف ہے کہ اسے مقاصد میں کامیابی ہوئی ہے اور حکومت کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہائی ویلیو ٹارگٹ۔ جس کے بارے میں مغربی میڈیا نے ایمن الظواہری کے وہاں ہونے کا تاثر دیا تھا غالباً ازبک لیڈر طاہر یلدے شیف تھا جو وہاں سے زخمی حالت میں فرار ہو گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا کہ القاعدہ کے انٹیلی جنس چیف عبداللہ احمد عبداللہ جو کہ ایف بی آئی کی موسٹ وانٹڈ لسٹ میں ہیں اس آپریشن کے دوران مارے گئے ہیں۔ لیکن آج مغربی میڈیا خصوصاً فوکس نیوز نے اس اطلاع کی تردید کردی ہے کہ ایف بی آئی کا یہ موسٹ وانٹڈ شخص وہاں پر مارا گیا ہے۔

اس تازہ ترین آپریشن میں دونوں طرف کا بھاری جانی نقصان ہوا ہے اور سرکاری ذرائع نے تسلیم کیا ہے کہ ان کے پاس یہ اطلاعات نہیں تھیں اور نہ یہ توقع تھی کہ اس کارروائی میں اس قدر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور جس دوران میڈیا ایمن الظواہری کی اس علاقے میں گھیرے جانے کے ممکنات پر تبادلہ خیال کررہا تھا تو عرب ٹی وی چینل نے ان کا ایک مبینہ آڈیو کیسٹ ریلیز کیا جس میں براہ راست ایمن الظواہری نے صدرِ پاکستان پر تنقید کی تھی چنانچہ صورتحال پیچیدگی اختیار کرتی چلی گئی اور افواج پاکستان کی طرف سے اس علاقے میں آپریشن کے خاتمے کے بعد شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کے علاقوں میں کچھ پمفلٹ بانٹے گئے جن پر لکھا تھا کہ کبھی طالبان یا القاعدہ کے مجاہدین سے الجھنے کی غلطی نہ کرنا اور ان قبائل کو خطرناک نتائج کی طاقت کی دھمکی دی گئی تھی جنہوں نے وفاقی حکومت سے تعاون کیا تھا اور مطلوبہ افراد کی مخبری کی تھی۔

اس کے بعد وزیرستان کے قبائلی نمائندوں نے جرگے کے سو سے زیادہ افراد کو

پگڑیوں کا تحفہ پیش کر کے اس تقریب میں تعاون پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس سلسلے میں تقریب وانا میں ہوئی اس میں فاٹا سے منتخب اراکین اسمبلی اور دوسروں نے اپنی تقاریر میں تمام قبائل کے متحد ہو کر لڑنے پر مبارک باد دی اور یہ کہا کہ انہوں نے اپنا مشن زندہ رکھا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایمن الظواہری، اسامہ یا القاعدہ کے اراکین کی موجودگی کے بارے میں پولیٹیکل انتظامیہ نے غلط اطلاعات دیں تھیں کیونکہ وہ ہمیشہ سے قبائل کے خلاف ہیں۔ اس جلسے میں یہ بھی کہا گیا کہ انتظامیہ نے علاقے میں 84 مکان مطلوبہ افراد کی تلاش میں مسمار کیے ہیں اور جن سرنگوں کو مطلوبہ افراد کے فرار کا رستہ ظاہر کیا گیا ہے وہ اس علاقے میں موجود کئی سال سے آب پاشی کے نظام کیلئے تیار کی گئی خندقیں تھیں۔ قبائل کے اس اجتماع میں مرنے والوں کو شہید قرار دے کر ان کی فاتحہ خوانی کی گئی اور سرکاری اہلکاروں کے جانی نقصان پر گہرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ان کے بڑوں کی غلط حکمت عملی کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ اس پورے واقعہ نے اس بات سے قطع نظر کہ اس میں سرکاری حکمت عملی درست تھی یا قبائل کا موقف، نئے سوالات کو جنم دیا ہے اور یہ سوال اہم ہے کہ کیا وفاقِ پاکستان کے اندر بسنے والے اس علاقے کے مکین اس قدر طاقت ور ہیں یا متحد کہ وہ ریاستی مشینری سے اس طرح لڑ سکتے ہیں اور اپنی شرائط منوا سکتے ہیں اور کیا حکومت کو اس مزاحمت کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔

یہ قبائل صدیوں سے اپنی روایات کے تحت رہتے آئے ہیں اور ان کے جتنے پارلیمنٹ کے نمائندے ماضی میں منتخب ہوئے ہیں انہوں نے حکومتِ وقت کے فیصلوں کی تائید کی ہے۔ نواز شریف ہوں یا بے نظیر بھٹو یا صدر ضیاء الحق یا کوئی دوسرا، سب نے فاٹا کے لوگوں کو آنکھیں بند کرا کے اپنے ہی حق میں تصور کیا ہے اور غالباً پہلی مرتبہ وہاں پر اس روایت کا بھی ناغہ ہو گیا ہے۔ یہ جو محسود قبیلہ ہے یہ 1914ء سے 1918ء کے درمیان 246 برطانوی فوجیوں کو ہلاک کرنے اور صرف ایک سال کے اندر 93 ہندو ساہوکاروں کو اغواء

کرنے کی تائید کرتا ہے۔انہوں نے 1917ء کے اپریل اور مئی کے دومہینوں میں 207 انڈین اور برطانوی مار دیئے تھے اور 140 کوشدید زخمی کیا تھا اور 238 جدید برطانوی رائفلیں چھین کر لے گئے تھے۔اس قبیلے کے کئی افراد جو طانوی فوج میں شامل ہو کر جنگِ عظیم اول میں لڑ رہے تھے،اپنے اصولوں کی پاسداری کے نام پر مخالف جرمن اور ترکوں سے جا کر مل گئے تھے اور برطانوی فوج کو اس جنگ کے بعد محسود قبیلے کی دس کمپنیوں کو ختم کرنا پڑا تھا۔انگریز نے اس جنگ کے خاتمہ کے بعد جنوبی پنجاب کی چار لاکھ اکیس ہزار ایکڑ اراضی ان افراد میں انعام کے طور پر تقسیم کی تھی جنہوں نے ترکوں کے خلاف انگریز کا ساتھ دیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ قبائل مکمل طور پر ان انعامات سے محروم رہے تھے۔وانا آپریشن کا اس مرحلہ پر اختتام حکومت کا ایک زبردست فیصلہ ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اور مقتدرہ حلقے کوئی ایسا بندوبست کریں کہ آئندہ کوئی ایسا تصادم اور ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے اور جس طرح یہ حلقے فوج کا بازوئے شمشیرزن ہو کر شمال سے آنے والے تمام طوفانوں کو اپنے سینے پر سہتے تھے۔وہ روایت پھر قائم ہو جائے۔ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت فوج اور ہر پاکستانی کا فرض ہے خواہ وہ راولپنڈی میں رہتا ہو کراچی یا وانا میں یا پھر اعظم ورسک میں۔یہاں یہ بات بھی بہت افسوسناک ہے کہ ایک طرف تو قبائل سے تعلق رکھنے والوں کے گھر مسمار ہوئے اور بہت سے بے گناہ سانحے میں مارے گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ افواج پاکستان کے اور پیراملٹری فورس سے تعلق رکھنے والے جوانوں کی شہادت بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

31 مارچ 2004ء

ایک اور چراغ بجھ گیا

ایک اور چراغ بجھ گیا۔ شیخ احمد یسٰین نے بھی جام شہادت نوش کرلیا۔ 66 سالہ یہ مجاہد جو کہ بچپن میں ایک حادثے کے نتیجے میں ایک مفلوج جسم کے ساتھ وہیل چیئر پر اپنی زندگی گزارتے رہے۔ علی الصبح مسجد میں نماز فجر ادا کرنے کے بعد اپنے رفقاء کے ساتھ واپس آرہے تھے کہ ایک اسرائیلی ہیلی کاپٹر سے داغے گئے میزائل سے بوڑھے شیخ کے ناتواں جسم کے پرخچے آڑ گئے اور پھر وہاں ان کی تمام زندگی کی رفیق وہیل چیئر ان کے خصوصی جوتے اور کوٹ کے چیتھڑوں اور خون کے دھبوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زندگی کا ابتدائی حصہ اخوان المسلمون میں گزارنے کے بعد انہوں نے حماس کی بنیاد رکھی تھی اور اسرائیل کے ساتھ سمجھوتے کے بعد یاسر عرفات کے اہم ترین حریف بن کر سامنے آئے تھے۔ 1989ء میں انہیں دو سو حماس کارکنوں کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا اور اسرائیلی فوجیوں پر حملے کے الزام میں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ 1997ء میں اسرائیل نے شیخ یاسین کو ان دو موساد کے ایجنٹوں کی رہائی کے بدلے میں رہا کیا تھا جنہیں اردن میں یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔ متعدد خودکش حملوں کے پیچھے حماس اہم ترین تنظیم رہی ہے اور 6 ستمبر 2003ء کو اسرائیلی فضائیہ نے اس عمارت پر جہاں شیخ یاسین رہائش پذیر تھے ساڑھے چھ سو پاؤنڈ وزنی بم گرایا لیکن شیخ صاحب بچ گئے تھے۔ حماس نے کہا کہ شیخ یاسین کو شہید کر کے اسرائیل نے اپنے لئے جہنم کے دروازے کھول لئے ہیں۔ یاسر عرفات کی الفتح

سے منسلک الاقصیٰ بریگیڈ اور دیگر تنظیموں نے بھی حماس کا مکمل ساتھ دینے کا اعلان کرتے ہوئے اسرائیل کو خاک وخون میں نہلانے کا اعلان کیا ہے اور آج ہر فلسطینی مسلمان کی آنکھ اشک بار ہے۔ تقریباً نابینا اور انتہائی علیل یہ مفلوج انسان ایک دفعہ پھر اس کہانی کی تجدید کر گیا ہے، کربلا کی ریت پر رقم ہونے کے بعد جو ابد تک اسی آب وتاب کے ساتھ لکھی جاتی رہیگی اور اپنے مقدس لہو کی حرارت سے دلوں میں وہ آگ بھڑکاتی رہے گی جو ظلم سے ٹکرانے اور کسی اعلیٰ وارفع مقصد کیلئے جان سے گزر جانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ شہنشاؤں کی شوکت و ثروت کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھنے والے سر بلند اسی شان بے نیازی کے ساتھ منزل جاناں کی طرف بڑھتے رہینگے۔ اپنی مادی قوت پر ناز کرنے اور اپنے لشکروں کی تعداد کو سرمایہ افتخار جاننے اور اپنے سازوسامان جنگ کو اپنی فضیلت اور برتری کا حوالہ سمجھنے والے اسی رعونت سے خدائی کا دعویٰ کرتے رہینگے اور اپنے نظریے کی صداقت اصولوں کی حقانیت اور مقصد کی سچائی پر کامل یقین رکھنے والے بے سروسامان اسی تمکنت اسی وقار اور اسی بانکپن کے ساتھ شہادت حقِ کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ قوت کے نشے میں مست ظالم اسی طرح فتح مند لیکن رسوا ہوتے رہیں گے اور حق کے پرچم بردار یونہی مفتوح شہید لیکن سر بلند رہیں گے۔ میزائلوں کے ٹکڑے اڑتے ہوئے جسموں کی راکھ اسی طرح جہانِ نو آباد کرتی رہیگی۔ شام غریباں کے نوحے یونہی نئی صبح کے افق پر دستک دیتے رہیں گے کہ اہل حق کیلئے یہی روحِ حیات اور مقصدِ کائنات ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ وقت کی فرعونی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہونے اور اپنی جانوں کو متاعِ حقیر سمجھ کر ازلی اور ابدی صداقتوں کیلئے اپنا لہو بہانے والے کبھی ختم نہیں ہونگے۔ سپاہِ ہمت وجوش اپنا سفر جاری رکھے گی۔ کبھی تیز دھار خنجروں، کبھی دو دھاری تلواروں، کبھی زہر میں بجھے تیروں اور کبھی کروز اور ڈیزی کٹروں کے ساتھ لیکن بے

سروسامان اور مردانِ وفاکیش کے خاک وخون میں تڑپتے لاشے آنے والوں کو پیغام دیتے رہینگے کہ سعادت وحق کا سفر جاری رہیگا۔ اگر تم اپنی زندگیوں کی خاطر خوف کا بکل مار کر بیٹھ گئے اور اگر چند آسائشوں اور تھوڑی سی مزاحمت کیلئے ظالم کی ہم نشینی قبول کر لی، نفع ونقصان کے میزان بنا کر مصلحت کشی کی چادر تان کر کسی صاحب کبر کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا تو تم ایک اچھے حکمت کار تو بن جاؤ گے لیکن آنے والی نسلیں تمہارا تذکرہ تک نہ کریں گی نہ تمہارے لئے کوئی آنکھ نم ہوگی اور نہ کوئی صف ماتم بچھے گی اور نہ کسی شام غریباں کا اہتمام ہوگا۔

شہادتوں کی داستان اپنی سرزمین پر بھی رقم ہو رہی ہے۔ وانا میں ادھر پاک افواج اور جنوبی وزیرستان کے مقامی قبائل کے درمیان طے پانے والی سیز فائر آج کچھ دیر پہلے ختم ہوگئی ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے پاک افواج کے قافلے پر بڑا حملہ ہوا ہے جس میں بارہ جوانوں کی شہادت کی اطلاع آ رہی ہے۔ یہ واضح رہے کہ تصادم کی فضا مزید گہری ہوتی جا رہی ہے اور پر امن مذاکرات سے اس تصفیہ کا حل اب ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان دونوں علاقوں میں وزیر قبائل رہتے ہیں اور ان کی افغانستان میں بھی گہری جڑیں ہیں۔ محسود اور آفریدی وہ واحد پاکستانی قبائل ہیں جو افغانی قبائل سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے لیکن اب محسود قبیلے کی طرف سے بھی پاکستان کی انتظامیہ کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر پاک فوج ان کے علاقے میں داخل ہوئی تو وہ وزیر قبائل کے ساتھ مل کر حملہ کرینگے جو کہ پہلے ہی پاک فوج سے لڑ رہے ہیں۔ باقی قبائل کے پاس اس وقت محدود تعداد میں اسلحہ باقی ہے اور وہ ایک بڑی جنگ کی توقع کرتے ہوئے اپنے حملوں میں کمی کر رہے ہیں اور انتہائی مہارت سے اپنے ٹارگٹ کو نشانہ بنا رہے ہیں جیسا کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہوا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قبائل اب اپنے قبضے میں موجود افراد کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بھاری نقصان کے بعد سیز فائر کی بھرپور کوشش کی گئی تھی لیکن حالات قابو میں نہیں آ رہے

ہیں۔ تازہ ترین حالات جاننے کیلئے ہم آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر میجر جنرل شوکت سلطان سے گفتگو کرتے ہیں۔

☆☆ جنرل صاحب یہ بتایئے کہ اس تازہ ترین واقعہ میں کسی نقصان کی شہادت کی اطلاع ملی ہے۔

☆☆ میجر جنرل شوکت سلطان نے کہا کہ دہشتگردوں نے راکٹ فائر کیا ہے۔ راکٹ فائر کرنے سے گاڑیوں کا اور کچھ جانی نقصان ہوا ہے۔ میں اس واقعہ کی تو تصدیق کر سکتا ہوں لیکن کتنا نقصان ہوا ہے کتنے لوگ شہید یا زخمی ہوئے اس کی اطلاع میرے پاس نہیں ہے۔ سیز فائر کے متعلق انہوں نے کہا کہ کل جو بات چیت ہوئی تھی جرگے سے وہ یہی بات ہوئی تھی کہ پولیٹیکل ایجنٹ نے اپنی شرائط بتائی تھیں کہ جرگہ یہ شرائط اندر موجود لوگوں تک پہنچا دے۔ جس وقت جرگے کے لوگوں نے اس علاقے کے اندر جانا تھا اس وقت آرمی کی سرگرمیوں کو روک دیا گیا تھا تاکہ جرگے کے لوگ بحفاظت اندر جا کر ان سے بات چیت کر سکیں اور وہی کارروائی آج ہوئی تھی۔ کسی قسم کا سیز فائر نہیں تھا آپریشن اسی طرح جاری ہے جیسے پہلے تھا۔ پہلی بات سیز فائر کے حوالے سے میں نے آپ کو واضح کر دی دوسری بات لڑائی کی ہے تو علاقے میں کسی قسم کی لڑائی نہیں ہے۔ دہشت گرد کچھ تھوڑے سے علاقے میں موجود ہیں اور وہ اس قسم کی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ یہ کارروائی انہی دہشت گردوں کی ہے۔ اس کو آپ کھلم کھلا لڑائی مت کہیں۔

جنوبی وزیرستان سے لائی گئی لاشوں کی شناخت کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ لاشیں اس آپریشن کے دوران کی ہیں۔ ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس ملک کے ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔ یہ سب کچھ ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد پتہ چلے گا اور یہ تمام وہ لوگ ہیں جو لڑتے ہوئے جاں بحق ہوئے ہیں۔ بے گناہ افراد کی لاشیں اس

طرح سے اٹھا کر نہیں لائی جائیں گی۔ ان افراد نے فرنٹیئر کور کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی تھی۔ فرنٹیئر کور کی جوابی کاروائی سے یہ لوگ ہلاک ہوئے تھے یہ کافی زیادہ لوگ تھے لیکن صرف ان دو لوگوں کی لاشیں وہ اٹھا کر لا سکے۔ ان کے پاس وہ تمام سامان تھا جو کہ عام سپاہی کے پاس ہوتا ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ لینے کیلئے جو نمونے لینے تھے وہ لینے کے بعد مذہب کے مطابق ان کی تدفین کی جا چکی ہے۔ آخری خبر آنے تک جرگہ کی واپسی تک اندھیرا ہو گیا تھا اور اس کے بعد جرگے کی پولیٹیکل حکام سے ملاقات نہیں ہوئی۔ شائد یہ ملاقات صبح کے وقت ہو اس کے بعد ہی اس کے متعلق کوئی معلومات مل سکیں گی۔ اس حملے کے بعد فوج کی جوابی کارروائی کے سوال پر انہوں نے کہا کہ اس کے متعلق اس طرح سے قیاس کرنا درست نہیں اور نہ ہی پاکستان آرمی کے منصوبوں کے متعلق میں اس طرح میڈیا پر وضاحت کرونگا۔ جس جگہ جس طرح اور طریقے سے بھی آپریشن کرنے کی ضرورت پڑے گی اس کے مطابق ہی آپریشن کیا جائیگا۔ فوج کی تعداد کے متعلق انہوں نے کہا کہ ریگولر اور پیرا ملٹری دونوں اس میں حصہ لے رہے ہیں اور جتنی ضرورت ہے اتنے دستے وہاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اضافی دستے تیار ہیں اس وقت جو آپریشن وانا میں جاری ہے اس میں جنوبی وزیرستان کے تمام قبائل شامل نہیں ہیں۔ بلکہ چھوٹا سا ذیلی قبیلہ شامل ہے جس کی ہمدردیاں دہشت گردوں کے ساتھ ہیں اور انہوں نے غیر ملکیوں کو پناہ دی ہوئی ہے۔ اس میں ان کے ذاتی مفادات ہیں۔ جس کی وجہ سے اس علاقے کے تمام لوگوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس علاقے کے تمام لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کیلئے ان غیر ملکیوں سے ہماری جان چھڑاؤ۔ میرے خیال میں جس دن غیر ملکی یہاں سے جائیں گے تو علاقے کے تمام عوام شکر ادا کرینگے۔

23 مارچ 2004ء

ملکی حالات اور آستین کے سانپ

کراچی کے محفوظ ترین علاقے ایسے بم دھماکوں کی زد میں ہیں جن کے نشانہ سے جلنے مرنے کراہنے اور سسکنے والے وہ بے گناہ مسلمان ہیں جنہیں یہ بتایا جارہا ہے کہ مسلمان اپنے ہی بھائیوں کو مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایسے جذبے جو کسی عقل و شعور کسی مقصد کسی نظریئے سے عاری ہوا کرتے ہیں وہ اپنے ہی بھائیوں کے شانوں سے اترتی گردنیں اور راکھ ہوتی تڑپتی لاشوں کو دیکھ کر یہ گماں کرتے ہیں کہ وہ امریکہ اور اسرائیل سے فلسطین، کشمیر، عراق اور افغانستان میں ہونے والی انسانیت سوز بربریت کا انتقام لینے میں سرخ رو ہو جائیں گے۔

مساجد میں اللہ کے سامنے سجدہ کرتے یا پھر رزق کی تلاش میں نکلنے والے خستہ حال بے بس انسانوں کی چیتھڑے کیا کسی فرعونی طاقت کے سرنگوں ہونے کا سبب بن سکتے ہیں۔ میں ہر دوسرے روز ان نادان نوجوانوں کے چہرے پر کپڑا اڈھانپ کر ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے ساتھ ان کے پولیس کے ہاتھوں ہانکے جانے کے مناظر دیکھتا ہوں جن میں سے کوئی کسی مسجد کوئی کسی امام بارگاہ کوئی کسی مارکیٹ کوئی کسی بازار کو راکھ بنانے کے منصوبہ سازی میں مصروف بتایا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کو کس اسلام کی کونسی حدیث، کس

فقہ اور بے گناہ انسانی جان لینے پر کس جنت کی کون سی بشارت کا درس دیا گیا ہے۔ میرے پاس اس سوال کا جواب تو نہیں لیکن 1954ء کا واقعہ ضرور میرے ذہن میں ہے جب امریکی صدر آئزن ہاور کو ان کے ایک مشیر نے بتایا کہ جناب ایرانی صدر ڈاکٹر مصدق اسلامی دنیا کا لیڈر بن کر ابھر رہا ہے۔ آئزن ہاور نے چونک کر اسکی وجہ پوچھی تو مشیر نے کہا کہ کیونکہ ڈاکٹر مصدق نیک کردار علم فراست رکھنے والی اور دلوں کو جیت لینے والی شخصیت ہے اور وہ ایک سچا اور باکردار مسلمان ہے۔

آئزن ہاور جو کہ اس وقت گالف کھیل رہا تھا اپنی گیند کو زوردار ہٹ لگاتے ہوا بولا ''ڈاکٹر مصدق کو بتا دو کہ صدر امریکہ گالف کا کتنا اچھا کھلاڑی ہے''۔ کسی تاریک مکان کے کسی اندھیرے تہہ خانہ تک اگر میرا تبصرہ پڑھا جا رہا ہے تو میں اگلے کسی مشن کی تیاری کرتے اپنے کم عمر معصوم اور نادان بھائیوں سے بھی مخاطب ہوں کہ امریکی صدر آئزن ہاور کے اس جملے کے چند ہی روز بعد روز ولٹ کے انتہائی شاطر پوتے کریمٹ روز ولٹ کو سی آئی اے نے ایک ملین ڈالر لاگت سے تیار کردہ ''چینج دا ورلڈ نامی'' منصوبہ کے حوالے کیا اور تاریخ نے دیکھا کہ وہ ڈاکٹر مصدق جو اسلامی دنیا میں امامِ کعبہ جیسی عزت و توقیر کا مالک بنتا جا رہا تھا گلیوں میں رسوا ہونے لگا۔ چوراہے پر اس کی تصاویر کو جوتے کے ہار پہنائے جانے لگے اور دیواریں ''مرگ بر مصدق'' کے نعروں کے پیچھے چھپ گئیں۔ کریمٹ چند دنوں بعد ڈاکٹر مصدق کو ذلیل و خوار کر کے ایران سے واپس امریکہ پہنچا تو اس نے ''چینج دا ورلڈ'' فائل کے اوپر اپنے قلم سے نوٹ لکھ دیا کہ The World Has Changed۔ کریمٹ کو اگلے روز صدر امریکہ نے تعریف و توثیق سے نواز نے وائٹ ہاؤس بلوایا اور اس سے ایران میں کھیلے گئے کھیل کی تفصیل پوچھی۔ کریمٹ نے صدر امریکہ آئزن ہاور کو پوری کہانی گوش گزار کرنے کے بعد کہا کہ جناب صدر کارنامہ تو میں نے بلاشبہ عظیم انجام دیا ہے لیکن میں آپ

کو ایک حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ آئزن ہاور نے تجسس سے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ کریمٹ نے جواب دیا'' وہ آپ سب کیلئے بہت کچھ پیغام رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ دنیا کے کسی بھی بڑے آپریشن سے پہلے امریکہ کو اپنی حدود و قیود کا تعین کر لینا چاہیے کیونکہ ہم کسی صورتحال سے فائدہ تو اٹھا سکتے ہیں لیکن کوئی صورتحال پیدا نہیں کر سکتے۔ جناب صدر ایرانیوں کے اس ہیرو یعنی ڈاکٹر مصدق کو سی آئی اے یا کریمٹ نے نہیں خود ایرانیوں نے مارا ہے اور خدا کی قسم اگر ایرانی نہ چاہتے تو تہران میں دنیا کا کوئی کریمٹ کوئی سی آئی اے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی خواہ صدر امریکہ اپنی پوری فوج کے ساتھ ہی وہاں نہ پہنچا ہو''۔

یہ تاریخی الفاظ انٹیلی جنس اسٹریٹیجی میں کریمٹ فارمولا کہلاتی ہے۔ اگر حکمران یہ کہتے نظر آ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ انتہا پسندوں کا کیا دھرا ہے۔ اگر مختلف وزیر یہ بیان فرما رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ملک دشمنوں کا کیا دھرا ہے۔ اگر سیاست دان چیخ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ بیرونی سازشیں ہیں تو مجھے یاد آتا ہے کہ وہ طاقت جو مشرق سے مغرب تک حکمرانی کے دعوے کے باوجود اس وقت صحراؤں کی ریت کے رحم و کرم پر قائم عراق کو اپنی پوری طاقت کے باوجود مسخر نہیں کر سکی اور تمام تر جبر کے باوجود ایران کو سرنگوں نہیں کر سکی اور تمام عسکری قوت کے باوجود نہتے طالبان کو قابو نہیں کر سکی وہ شاید آج بھی پینٹا گون کی کئی فائلوں پر لکھتی ہو کہ ہم ان ملکوں میں کوئی صورتحال پیدا نہیں کر رہے۔

ہمارے ہاں بھی اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تناظر میں، میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کہ کیا کریمٹ روزولٹ نے غلط کہا تھا۔ کیا دنیا کی کوئی طاقت کسی ملک کو اندر سے کمزور کر سکتی ہے۔ میرا جواب ہوگا نہیں۔ کیونکہ جس بدن میں صحت مند خون دوڑ رہا ہو اس پر کبھی کسی وائرس کا حملہ کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن جس چوکھٹ کو دیمک چاٹ جائے اس کے کواڑ ایک ہی دستک کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ چودہ سو سال پہلے ہمارے چار میں

سے تین خلفائے راشدین شہید کر دیئے گئے تھے اور ان میں سے دو مساجد میں۔ کیا آج کا کوئی کریمٹ ہماری انہی کمزوریوں سے کھیل کر ہمارے نوجوانوں سے ہی ہمیں ختم کروانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ اگر ملک اندر سے ہی کھوکھلا ہو جائے تو پھر ہر گلی ہر محلے میں کریمٹ راج کیا کرتے ہیں اور تباہی کیلئے ہمیں کسی بیرونی کریمٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امت مسلمہ کے نوجوانوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے ان کو کس کی نظر لگ گئی ہے وہ کون سے پوشیدہ ہاتھ ہیں جو کہ انہیں استعمال کر رہے ہیں۔ ان نادانوں کو خود کیوں سمجھ نہیں آتی کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ کیا اپنے ہی بھائیوں کا خون سستا لگتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو کیوں کمزور کر رہے ہیں۔ کیوں ہم اپنی بنیادیں خود کھوکھلی کر رہے ہیں۔ اے پوشیدہ ہاتھو باز آ جاؤ ورنہ بہت برا ہوگا کہ تمہاری باری بھی آنے والی ہے۔

26 مئی کو ہر سال کی طرح مجھے پھر چند دوستوں نے نیک تمناؤں کے پیغامات بھیجے ہیں اس لئے چند اشعار ان لوگوں کی نذر کر رہا ہوں۔

زندگی تیز بہت تیز ہوا کا جھونکا۔۔۔
جلتی بجھتی ہوئی شمعیں ہیں مہ و سال میرے
ڈھلتا سورج میرے ماضی کی لحد کا کتبہ
ریگ صحرا کی لکیریں ہیں خدوخال میرے
میرا چہرہ میرے مقتول ہنر کی تاریخ
میری آنکھیں میری دُکھتی ہوئی راتوں کے چراغ
میرے ہونٹوں پہ میرے پیاس کے نوحوں کا ہجوم
میرے سینے پہ درخشاں میری توہین کے داغ
آج کی شام کے ہر سال اسی شام کے ساتھ

میری اکھڑی ہوئی سانسوں کو گراں لگتی ہے
آسماں وقت کے آنچل کی دھنک بنتا ہے
ساری دھرتی تنِ عریاں کی سرا لگتی ہے
آج کی شام کے ہر سال میرے زخم نواز
مسکراتے ہوئے کچھ پھول عطا کرتے ہیں
کچھ مسیحا میری خاطر میرا دل رکھنے کو
خط میں جینے کی دعا بھیج دیا کرتے ہیں
سالہا سال گزرنے پہ بھی اے دل زدگاں
آج کی شام مناتے ہوئے ڈر لگتا ہے
مسکراتے ہوئے چہروں کے بھنور ہیں لیکن
آخری شمع جلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
جلتی بجھتی ہوئی شمعوں کا بھروسہ کیا ہے
زندگی تیز بہت تیز ہوا کا جھونکا۔۔۔

27 مئی 2004ء

موسٹ وانٹڈ۔۔۔۔!

مجھے آج ایک خاتون کی تلاش ہے۔صرف میں ہی نہیں اس خاتون کے اہل خانہ بھی اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔دنیا بھر کے ہوائی اڈوں پر بھی اس کی تصاویر موجود ہیں۔حساس اداروں کے پاس اس کی تمام تفصیلات ہیں اور امریکن حساس ادارے ایف بی آئی کی طرف سے دنیا بھر کے انتہائی مطلوب ترین افراد کی فہرست میں یہ انتہائی تعلیم یافتہ پاکستانی نژاد خاتون ایک انتہائی خطرناک دہشت گرد قرار دی جا چکی ہیں جس کی گرفتاری کی خبر دینے والے کیلئے بھی بھاری انعام رکھا گیا ہے۔یہ خاتون ایک ممتاز امریکی جامعہ سے نیورولوجیکل سائنسز میں پی ایچ ڈی کرنے والی ڈاکٹر عافیہ صدیقی ہیں۔

اسلامی شعائر کی سختی سے پابندی کرنے والی عافیہ صدیقی کی بوسٹن میں ایک پاکستانی ڈاکٹر محمد امجد خان سے شادی ہوئی تھی پھر دونوں میں قانون کے مطابق طلاق ہوگئی پھر گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعات کے بعد وہ کافی عرصے تک خود بھی بوسٹن میں رہیں۔ 32 سالہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی امریکہ کے انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں دس سال تک حصولِ تعلیم کے بعد 2002ء میں واپس پاکستان آ گئی تھیں۔یہاں کسی مناسب ملازمت کے

حصول میں ناکامی کے بعد وہ پھر فروری 2003ء میں امریکہ گئیں۔ تاکہ وہاں یو ایس امیگریشن اتھارٹیز کو درخواست کے علاوہ ملازمت تلاش کر سکیں۔ وہ اس مہینے کے آخر میں یعنی 2003ء میں ہی امریکہ سے واپس کراچی پہنچ گئیں اور آنے سے پہلے انہوں نے امریکی شہر میری لینڈ میں ایک پوسٹ بکس کرائے پر حاصل کیا تھا تاکہ ان کی ڈاک وہاں پہنچتی رہے۔ اب ایف بی آئی کا دعویٰ ہے کہ یہ پوسٹ بکس ماجد خان نامی شخص کے نام پر حاصل ہوا تھا جو القاعدہ کا ایک رکن ہے۔

مارچ 2003ء میں تمام امریکن ٹی وی چینلز ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی تصویر ایک خطرناک دہشت گرد کے طور پر دکھا کر عوام سے ان کی گرفتاری میں تعاون کی اپیل کرتے رہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ اس خطرناک صورتحال کے پیش نظر کراچی میں موجود عافیہ صدیقی کہیں روپوش ہوگئیں تھیں۔ 25 اور 31 مارچ 2003ء کے درمیان ڈاکٹر عافیہ صدیقی نے اپنی والدہ کو کراچی کے کسی مقام سے فون پر بتایا تھا کہ وہ راولپنڈی جانا چاہتی ہے۔ اگلے ہی روز ایک ممتاز اردو اخبار نے کراچی ایئرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی گرفتاری کی خبر شائع کی تھی ان کے ساتھ ان کے تین چھوٹے بچے بھی تھے جن کی عمریں ساڑھے تین ماہ سے 7 برس کے درمیان تھیں۔

یکم اپریل 2003ء کو وفاقی وزیر داخلہ فیصل صالح حیات کا مختصر سا بیان اخبارات میں شائع ہوا جس کے مطابق ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی گرفتاری کی تردید کی گئی۔ 2 اپریل کو وزیر داخلہ کی ایک اور پریس کانفرنس اخبارات کی زینت بنی جس میں انہوں نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی گرفتاری کی ایک بار پھر تردید کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ان کا تعلق القاعدہ سے ہے اور اگر آپ کو ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی حرکتوں کا علم ہو جائے تو آپ لوگ حیران ہو جائیں گے۔ چند ہی روز بعد موٹر سائیکل پر سوار سادہ لباس میں ملبوس ایک شخص ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی

والدہ عاصمہ صدیقی کی گلشن اقبال کراچی میں موجود رہائش گاہ پر پہنچا اور بتایا کہ ان کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں ہے یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس کی خیریت چاہتی ہیں تو بیان بازی کے بجائے خاموشی اختیار کرلیں ورنہ انکی بیٹی کا انجام بھی آصف بھوجا جیسا ہوگا۔ آصف بھوجا آپ کو یاد ہوگا امریکن صحافی ڈینئل پرل کے اغوا اور قتل میں ملوث قرار دیا جارہا تھا لیکن جب پولیس اس کی گرفتاری کیلئے اس کی رہائش گاہ پر پہنچی تھی تو وہ وہاں مردہ پایا گیا تھا۔ ممتاز امریکی ہفت روزہ نیوز ویک کی 23 جون 2003ء کی اشاعت القاعدہ سے متعلق تھی اور اس جریدے کا ایک مضمون القاعدہ نیٹ ورکس ان امریکہ کے نام تھا۔ اس مضمون میں القاعدہ کے تین اراکین کی تصاویر شائع کی گئیں تھیں۔ خالد شیخ محمد، ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور قطر کے شہری علی احسن المری، علی احسن المری ڈاکٹر عافیہ کی ہی طرح کئی سال پہلے امریکہ میں تعلیم حاصل کر کے واپس اپنے وطن یعنی قطر جاچکا تھا۔ نیوز ویک کے اس مضمون میں جسے آٹھ صحافیوں نے پچھلے برس لکھا تھا ڈاکٹر عافیہ پر واحد فرد جرم یہ عائد کی گئی تھی کہ انہوں نے بالٹی مور کے ایک سابق رہائشی ماجد خان کے نام پر ایک پوسٹ بکس حاصل کرنے میں تعاون کیا تھا تا کہ اس کی شناختی دستاویز تیار ہوسکیں اور یہ شخص القاعدہ کا رکن تھا چنانچہ اس مضمون کے مطابق غالب امکان یہی ہے کہ ڈاکٹر عافیہ القاعدہ کے امریکہ آنیوالے دیگر اراکین کی بھی اسی طرح مدد کرتی رہی۔ نیوز ویک نے اپنے اس مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو پاکستان میں گرفتار کرلیا گیا ہے پھر کئی متضاد خبریں اور بیانات سامنے آتے رہے۔

کئی امریکن اخبارات کا دعویٰ تھا کہ وہ امریکہ کے پاس ہیں۔ کسی نے لکھا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ 30 دسمبر 2003ء کو ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بہن ڈاکٹر فوزیہ صدیقی جو کہ خود بھی نیورولوجسٹ ہیں انہوں نے بتایا کہ انہیں وزیر داخلہ فیصل صالح حیات نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر عافیہ کو رہا کردیا گیا ہے آپ گھر جائیں آپ کو وہ جلد فون کرلیں گی لیکن ڈاکٹر عافیہ

صدیقی کا اس کے بعد کوئی فون نہیں آیا اور 26 مئی کو چند ہی روز پہلے امریکا کے اٹارنی جنرل جون اور ایف بی آئی کے سربراہ رابرٹ ملر نے ایک مشترکہ کانفرنس میں انکشاف کیا کہ امریکا پر ایک اور دہشت گرد حملہ متوقع ہے اور اس میں 7 دہشتگرد ممکنہ طور پر ملوث ہیں۔ انہوں نے میڈیا کے سامنے 6 مردوں اور ایک عورت کی تصویر پیش کی جو کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی تصویر تھی۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون جو کہ ایک بہن بھی ہیں بیٹی بھی اور اپنے تین کم سن بچوں کے ساتھ پچھلے ایک سال سے لاپتہ ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کسی امریکی عقوبت خانے میں ہیں یا کسی پاکستانی زندان میں یا افغانستان سے کسی اندھے کنویں میں قید ہیں، گونتانا موبے کے پنجرے میں بند ہیں یا پھر یہ کہ وہ اپنے بچوں کیساتھ کسی ویران علاقے میں گمنام قبر میں سو چکی ہیں۔ لیکن بدقسمت عافیہ صدیقی اور اسکے تین کم سن بچوں پر کیا گزری خدا کرے وہ خود سامنے آ کر یہ سب کچھ بیان کر سکیں۔ آج سے دو سال پہلے اسی طرح غائب ہو جانے والے ایک نوجوان کا اپنے پروگرام میں تذکرہ کیا تھا۔ لاہور کا ایک نوجوان ایک ممتاز ڈاکٹر عامر عزیز جسے اس کی رہائش گاہ سے مختلف الزامات کے تحت حراست میں لے لیا گیا تھا آج دو سال بعد وہ نوجوان پہلی مرتبہ میڈیا پر بات کرنے جا رہا ہے ڈاکٹر عافیہ پر کیا گزری ہوگی شاید اس شخص سے بہتر کوئی دوسرا سمجھ اور محسوس نہ کر سکے۔

☆☆ ڈاکٹر صاحب آج سے دو سال پہلے میں نے اپنے پروگرام میں آپ کا تذکرہ کیا تھا اور ٹھیک دو سال بعد آپ سے بات چیت ہو رہی ہے؟

☆☆ جی ڈاکٹر شاہد صاحب میں پہلی مرتبہ کسی میڈیا پر بات کر رہا ہوں اور اس سے پہلے کسی میڈیا پر بات نہیں کی۔

☆☆ ڈاکٹر عامر عزیز آپ پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے آپ ہی کی طرح ایک اور پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی لاپتہ ہیں امریکن ایف بی آئی کا کہنا ہے کہ وہ Most

Wanted لسٹ پر ہیں اور پاکستان میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس نہیں ہیں وہ کہاں غائب ہوگئی ہیں آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟

☆☆ میں تو صرف یہی کہوں گا کہ اب امریکہ نے ساری دنیا میں اپنا سچائی والا لبادہ کھودیا ہے اور امریکہ کی اصلیت دنیا کے سامنے کھل کر سامنے گئی ہے۔ جس وجہ سے افغانستان اور عراق میں داخل ہوا تھا وہ وجہ ہی غلط تھی لیکن ہماری یعنی مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر طاقت ہے اور وہ جس طرح چاہے جو کرسکتا ہے اور کررہا ہے اس لئے مجھے تو ایف بی آئی کی بات پر کوئی اعتماد نہیں ہے کیونکہ یہ سارے جھوٹے اور فریبی ہیں ان کی باتوں پر اب کوئی یقین نہیں کرے گا اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت مسلمان دنیا میں ایک ارب سے بھی زیادہ ہیں لیکن انتہائی بے بسی کی حالت میں ہیں اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ہم اپنے دین سے دور ہوگئے ہیں اور ہم تمام مسلمان ایک ملت بنانے میں ناکام ہیں۔ ہمارے اکثر ممالک کے حکمران صرف اپنا اقتدار بچانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے پیارے نبی کی ایک حدیث جو کہ آج اس دور میں پوری اترتی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ مسلمان تو بہت زیادہ ہونگے لیکن کفاران پر گدھوں کی طرح جھپٹیں گے تو جب صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا ہم بہت کمزور ہوجائیں گے اور بہت کم ہوجائیں گے تو انہوں نے فرمایا نہیں ہم میں وہم کی بیماری ہوجائے گی تو پوچھا گیا کہ وہم کیا چیز ہے تو انہوں نے کہا کہ موت کی کراہت اور دنیا کی محبت۔ بدقسمتی سے جو کمزور ہے وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں اور اسی وجہ سے اب ہم بالکل بے بس ہیں اب بھی وقت ہے کہ ملت اسلامیہ اکٹھی ہوجائے تو حالات بدل سکتے ہیں۔ ہم اللہ سے معافی مانگیں تو ہمارے اندر چودہ سو سال پہلے والا جذبہ اور ایمان آسکتا ہے۔

میں 89 سے جب افغانستان کا جہاد زوروں پر تھا اس وقت جو بھی زخمی آتے تھے میرے پاس، میں ان کا علاج کرتا تھا اور اللہ کے کرم سے میں ان کا مفت علاج کرتا تھا اور اس وقت یہ جہاد ٹھیک تھا کیونکہ امریکہ خود اس میں شامل تھا اور امریکہ نے خود انہیں جہاد کے لئے تیار کیا تھا اور اب انہوں نے ایک سو نوے ڈگری کا ٹرن لے لیا ہے تو اب ہر چیز جو اس وقت جائز تھی اب ناجائز ہوگئی ہے اور مجھ پر الزام یہ تھا کہ میں ان لوگوں کا علاج کرتا ہوں دوسرا میں نے ان کو کیمیائی بم بنانے میں مدد دی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ بھائی اس ڈاکٹر کا کیا کام کہ بم بناتا پھرے تو ان کے پاس جواب موجود نہیں تھا اور اسی الزام کے تحت مجھ سے تفتیش کرتے رہے یہ پوچھنے کیلئے کہ وہ لیبارٹریاں کہاں ہیں جہاں پر آپ لوگ بم بناتے ہیں اور میں نے ان لوگوں کی مدد کی انہوں نے مجھ پر طرح طرح کے ظلم کئے مگر مجھ پر کوئی جرم ثابت نہ کر سکے جو میں نے کیا ہو کیونکہ یہ لوگ خود جھوٹے تھے میں ایک ڈاکٹر ہوں میرا کام علاج کرنا ہے چاہے وہ کسی بھی نسل کا انسان ہو یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کا علاج کروں۔ اگر میں نے علاج کیا تھا تو کیا برا کیا۔ اب امریکہ نے ان لوگوں کو دہشت گرد قرار دے دیا ہے کیونکہ اب یہ لوگ اس کے کام کے نہیں۔ یہ پوری امت مسلمہ کو سوچنا چاہیے کہ ہم کس ڈگر پر چل رہے ہیں۔

13 جون 2004ء

اسلامی طرز حکومت

آج کے مسلمان سرعت کے ساتھ خطرناک معاشرتی خلیجوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہ خلیجیں صرف روائتی دینی اور لادینی طبقات کے درمیان ہی نہیں بلکہ خود دینی طبقات کے بیچ بھی ہیں۔ باوجود اس حقیقت کے کہ بیشتر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اسلام ان کی زندگیوں میں ایک بنیادی جز کے طور پر رائج ہو جائے، اسلامی نظام ہے کیا اس پر کوئی اتفاق رائے نہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے معاشی اور سیاسی اصول ہر آنے والے دور سے مناسبت رکھتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک اور مشکل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ قانون اسلامی کی کوئی چھوٹی بڑی شق ایسی نہیں جس پر تمام مدارسِ فکر متفق ہوں۔ فرقے کی پیچیدگیوں کے پیش نظر سادہ لوح مسلمانوں کے پاس کوئی چارہ نہیں کہ وہ فقہاء کی آراء کو اندھا دھند مانیں اور اس تقلید کے باعث وہ حکومتی طاقت کی بے اطاعتی کی افسوس ناک روایت کی طرف دھکیلے جا چکے ہیں اور چوتھی صدی ہجری کے بعد سے مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی زندگی ایک مکمل جمود کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ فکر کی جو بھی لرزشیں ہمارے عہد خلافت سے سرزد ہوئیں ہو ہمارے روائتی فقہ کا حصہ بن گئیں اور ان کی اصلاح کیلئے کوئی بھی دروازہ کھلا نہ رہنے دیا گیا۔ یہ بات طے ہے کہ جب تک شریعت کے خدوخال مواد اور مقاصد کے متعلق رائج پریشان خیالات ذہنی الجھنیں اور پیچیدگیاں رفع نہ کر لی جائیں تب تک مسلمان ذہنی الجھنوں کا شکار رہیں گے۔

ہمارے ہاں ایک طرف تو وہ مغرب زدہ دانشور ہیں جو ایک آزاد خیال اور سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کو ہی موجودہ دنیا میں بقا کا واحد راستہ سمجھتے ہیں جبکہ دوسری طرف خود ہمارے بیشتر علماء اور دینی اکابرین کی اپنی آراء اتنی غیر فیصلہ کن اور متضاد ہوا کرتی ہیں کہ کسی کارگر پالیسی سازی کیلئے کارآمد ثابت نہیں ہو پاتیں اور ان کا بے لچک رویہ اور غیر ضروری تفصیلات پر بے جا اصرار اسلام کو ایک سخت اور بے لچک مذہب بنا کے پیش کرتا ہے مثلاً ہمارے علماء اب تک اس اہم ترین معاملے پر متفق نہیں ہو سکے کہ وہ جس اسلامی ریاست کے قیام کیلئے نعرہ بلند کرتے ہیں وہاں کس طرح کا طرز حکومت دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ایک مغربی انداز کا جمہوری معاشرہ جہاں مکمل اسلامی اقدار کا نفاذ ہو یا پھر وہ طرز حکمرانی جو اسلام کے ابتدائی دور میں قائم ہوئی تھی اور جس کی مثال مدینہ کی ریاست یا پھر خلفاء راشدین کے دور سے دی جاتی تھی۔ اس دور پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ رسولؐ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رائج طرز حکومت بھی نظر میں رکھیں۔ آپؐ کی پیدائش کے وقت شہر مکہ میں ایک شہری مملکت موجود تھی جس کا رقبہ حدود حرم کے تقریباً 130 مربع میل تھا یعنی وہاں بادشاہت نہیں بلکہ ایک طرح کی مجلس وزراء انتظامات کی ذمہ دار تھی۔ خانہ کعبہ کا انتظام یعنی دروازہ کھولنے اور بند کرنے کیلئے ایک وزیر تھا اور یہ معلوم کرنے کیلئے کہ کوئی کام ہمیں کرنا چاہئے کہ نہیں ان کے پاس تیر ہوا کرتے تھے اور ان تیروں کی نگرانی کیلئے ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ باہر سے آنیوالے زائرین کعبے پر چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے اور ان کی حفاظت کیلئے بھی ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اس طرح ٹیکسیشن کیلئے بھی ایک وزیر موجود تھا اور ان ٹیکسز کا مقصد یہ بیان کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی حاجی مکے میں کسی ناگہانی آفت کا شکار ہو جائے مثلاً اس کی سواری کا اونٹ مر جائے اس کے پاس پیسے ختم ہو جائیں تو ایسے مجبور لوگوں کی مدد کیلئے یا پھر حج کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کی ضیافت اور مہمانداری پہ خرچ

کیلئے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا اور اس کی نگرانی کیلئے بھی ایک خصوصی وزیر مخصوص تھا۔ مکہ میں ایک پارلیمنٹ یا دارالاندوہ بھی موجود تھی جب بھی کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا مثلاً کسی بیرونی حملے کا خطرہ ہوتا تو سارے معمر اور تجربہ کار باشندے ایک جگہ جمع ہو جاتے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مکے کا ہر شخص جونہی چالیس سال کی عمر کو پہنچتا تو خود بخود اس مجلسِ مشاورت یا پارلیمنٹ کا رکن بن جاتا۔ تاریخی کتابیں ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس قانون میں لچک لا کے ایک نوجوان کو کیونکہ اس کی فہم و فراست سے اہل مکہ بہت مرعوب تھے اس مجلس مشاورت کا رکن بنا دیا گیا اور اس شخص کا نام ابوجہل تھا۔ پھر وہاں ایک وزیر خارجہ بھی موجود تھا جس کے فرائض میں دوسرے قبیلوں کے ساتھ معاملات طے کرنا ہوتا یا دشمن کے مطالبات نہ ماننے کی صورت میں اعلانِ جنگ کرنا ہوتا۔ یہ سب اس کے فرائض میں شامل تھا۔ پہلے چالیس سال تک حضورؐ اسی شہر کے ایک باشندے رہے اور اس دوران کوئی ایسی بات ہمیں نظر نہیں آئی جو قابل ذکر ہو سوائے اس کے کہ اور قبیلوں کی طرح رسولؐ کے خاندان یعنی بنو ہاشم کا بھی ایک فرد اس نظامِ حکومت میں شامل ہوا کرتا تھا یعنی ایک وزارت اس خاندان کے بھی سپرد تھی اور وہ وزارت زم زم کے کنویں سے متعلق تھی۔ یہ کنواں چونکہ ایک طویل مدت تک غائب رہنے کے بعد حضرت عبدالمطلب نے دریافت کیا تھا اس لئے وہ اس کی نگرانی کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت ابوطالب نے اس کنویں کی نگرانی سنبھال لی۔ حضرت ابوطالب دل کے بہت کھلے تھے لیکن ان کے مالی حالات بہت خراب تھے اور وہ اکثر قرض لینے پر مجبور ہو جایا کرتے ایک مرتبہ انہوں نے اپنے بھائی حضرت عباس سے کچھ رقم قرض لی اور کہا کہ میں ایک سال بعد یہ قرض ادا کر دونگا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے اور اس کے بعد حضرت عباس نے کہا کہ اگر تم مزید مہلت چاہتے ہو تو زم زم کے کنویں کی نگرانی میرے حوالے کر دو اس طرح زم زم کا کنواں حضرت عباس کی نگرانی میں

آ گیا اور فتح مکہ کے وقت وہی اس کے مالک تھے اور رسولؐ نے بھی اس کی توثیق کر دی تھی۔

مکے کے برعکس مدینہ میں کسی مملکت کا وجود نہیں تھا یہاں اسلام سے پہلے کئی قبیلے آباد تھے اور اس کے اثرات خود اسلامی معاشرے پر بھی ایک طویل عرصے تک پڑتے رہے۔ حضورؐ کی مدینہ آمد سے پہلے مدینہ کے کچھ لوگ اَوس قبیلے سے اور کچھ خزرج قبیلے سے مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ ان دونوں قبیلوں میں جھگڑا رہتا تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مکے سے ایک امام بھیجا گیا کہ دونوں قبیلے اس کے پیچھے نماز پڑھ سکیں۔ رسولؐ نے مدینہ آمد کے بعد جس جگہ قیام فرمایا تھا ہروجیوں کا علاقہ تھا۔ امام بخاری کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابومطلب کی والدہ خزرج قبیلے سے تھیں۔ بنو ہجار قبیلے کے اس مقام پر آپؐ نے ایک جلسہ طلب کیا اور مدینے کی آبادی کے مختلف نمائندوں کو بلایا اور ایک حکومت کے قیام کی تجویز ان کے سامنے رکھ دی۔ چار نمائندوں کے علاوہ سب نے اس پر اتفاق کر لیا۔ اس طرح ایک ایسی مملکت قائم ہوئی جو ابتدائی طور پر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل ہونے کے باوجود علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے ایک امتیازی حیثیت یوں رکھتی تھی کہ ایک مملکت میں حکمران اور رعایا کے جو حقوق و فرائض ہوتے انہیں تحریری طور پر مرتب کیا گیا تھا۔ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ مملکت ایک مستقل اور خود مختار مملکت ہوگی اور یہ بھی وضاحت کی گئی تھی کہ مسلمانوں کیلئے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کیلئے یہودیوں کا دین یعنی وہاں جتنے بھی لوگ بستے تھے ان کو دینی عدالتی اور قانونی آزادی کا یقین دلایا گیا تھا۔ ہمارے ہاں اس مدنی ریاستی ماڈل کے علاوہ دوسرا ذکر خلافت کا کیا جاتا ہے اور ایک تضاد ہمیں تاریخ سے یہ ملتا ہے کہ ہمارا آئیڈیل تو خلافت ہے لیکن تاریخ ہماری ملوکیت کی رہی ہے۔ خود ہمارے دینی اکابرین بھی اس فکری تضاد کا شکار ہیں کہ وہ ملوکیت کو معتوب تو ٹھہراتے ہیں لیکن مثالیں بھی ملوکیت کے ادوار کی دی جاتی ہیں۔

مسلمانوں کی سوا چودہ سو سال کی تاریخ میں رسولؐ اور خلافت راشدہ کی کل مدت محض 40 سال تھی جسے مثالی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ مثالی دور دیرپا ثابت نہیں ہوا لیکن دنیاوی جاہ و جلال کے میدان میں عباسی سلطنتوں سے بڑی سلطنت دنیا نے کبھی نہیں دیکھی اور انہی ادوار میں مسلمانوں کے اقتدار کا ستارہ عروج پر جا پہنچا۔

9 جولائی 2004ء

الزرقاوی اور متحدہ مسلم لیگ

ایک 26 سالہ امریکی قیدی نک بارلر کی گردن تن سے جدا کرنے کے مناظر دکھاتی ایک ویڈیو فلم ریلیز کی گئی ہے دنیا بھر کے ٹی وی چینلز کی طرح ہم نے بھی اس کی فلم دکھائی ہے دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ اقدام اٹھانے والا شخص اردن سے تعلق رکھنے والا القاعدہ کا مرکزی رہنما الزرقاوی ہے اس ویڈیو فلم میں چند نقاب پوش ایک بے بس امریکی شہری کے پیچھے کھڑے ہیں۔ پس منظر میں عربی پیغام پڑھ کر سنایا جا رہا ہے اور اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور درمیان میں کھڑا ایک شخص اپنے لباس میں سے ایک تیز دھار خنجر نکالتا ہے۔ بے بس امریکی شہری کو دبوچ کر زمین پر لٹا کے اس کی گردن جسم سے الگ کر دیتا ہے۔ فضا میں اللہ اکبر کے نعروں کے دوران گردن فضا میں بلند کی جاتی ہے۔ یہ ویڈیو فلم عین اس وقت دنیا کے سامنے لائی گئی ہے جب میڈیا صرف اور صرف عراق کی ابوغریب جیل میں بے بس عراقی قیدیوں کی امریکی فوج کے ہاتھوں ذلت اور رسوائی کے مناظر دیکھ رہا تھا۔

صدر بش نے انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اس بہیمانہ کارروائی میں ملوث دہشتگردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے کیونکہ یہ انسانیت کے دشمن ہیں یہ ویڈیو فلم ایک ویب سائٹ پر ریلیز ہوئی ہے اور اسکا دعویٰ ہے کہ امریکی شہری کو ذبح کرنے والا نقاب

پوش الزرقاوی ہے۔ الزرقاوی کی گرفتاری پر پانچ ملین ڈالر کا انعام رکھا گیا ہے۔ پس منظر سے سنائی دیا جانے والا پیغام صدر جارج بش کو یہ ہے کہ تم اور تمہارے فوجی اس دن پر ہمیشہ افسوس کریں گے جس دن انہوں نے عراقی سرزمین پر قدم رکھا اور تمہارے لئے بدترین وقت آنے والا ہے۔

ابو غریب جیل میں انسانوں کے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کر کے دنیا بھر میں ذلت اور رسوائی کا نشانہ بننے والے امریکی فوجیوں کیلئے یہ ویڈیو فلم کیا کسی بھی طرح ایک سہارے کا کام کر سکتی ہے۔ کیا اس فلم میں موجود نقاب پوشوں کو مسلمان یا القاعدہ کا الزرقاوی ثابت کر کے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ ان کے مدمقابل دہشت اور بربریت کا مظاہرہ کرتے عراقی ہیں اس لئے امریکی فوج کے سپوتوں نے اگر انسانیت سوز رویہ اپنا ہی لیا تو کون سا جرم کیا اور یہ کہ جب کوئی قوم حالتِ جنگ میں ہوتی ہے تو وہاں انسانی اقدار کی پاسداری اہم نہیں ہوا کرتی ہے اور یہ کہ 1899ء کے امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ گلینی روٹ کا یہ نظریہ اب کامیاب نہیں رہا کہ امریکی فوجی دنیا کی تمام اقوام کے فوجیوں سے مختلف ہوتے ہیں کہ وہ انصاف اور امن کے پیروکار ہوا کرتے ہیں۔ وہ اپنے فوجیوں کے اقدامات کو قوم کا وقار قرار دیتے ہیں اور اسی امریکی عظمت کو امریکی تہذیب و تمدن کا ایک اشارہ کہا جاتا ہے۔ امریکی دانشور اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ امریکی عوام خدا کے منتخب اہم لوگ ہیں جنہیں پہاڑی پر شہر بسانے کا مشن سونپا گیا کہ پوری دنیا ان کے تابع ہو گی۔ جرمنی میں نازی شکست اور سویت یونین کے پندرہ سال پہلے فاتح کے دوران امریکہ مسلسل پوری دنیا کو اپنے عدل و انصاف اور انسانی حقوق کے علمبردار ہونے پر آگاہ کرتا رہا۔ اگر آپ نے امریکہ اینڈ آف ہسٹری پڑھی ہے تو آپ کو مصنف کے اس نظریے کا علم ہو گا کہ آٹھ ہزار سال بعد انسانی تہذیب نے آخر کار ایک جمہوریت اور عدل و انصاف پر مبنی ایک معاشرے

کے قیام کو ممکن بنا ہی لیا اور یہ معاشرہ کوئی اور نہیں صرف امریکی معاشرہ ہی ہے۔ آج امریکی اس سوال کے جواب کے ساتھ دنیا کے سامنے نہیں آ پا رہے کہ وہ مثالی معاشرہ جس کے قیام کیلئے صدر امریکہ اپنی فوجیں دنیا بھر میں اتار رہے ہیں کیا خود ان کے ہاں موجود نہیں اور کیا ان کی اپنی قوم یا فوج کسی اعلیٰ ارفع حصول کے ماتحت ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ ایسی وڈیو فلمیں جاری کر کے اپنے دامن پر لگے چھینٹے کہاں تک دھو سکتے ہیں اور عراقیوں پر مظالم کی وڈیو فلم کی ریلیز سے کس القاعدہ تنظیم کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ جب پوری دنیا انسانیت سوز مظالم پر امریکہ کی مزاحمت کر رہی ہے اگر فائدہ ہو رہا ہے تو یہ وڈیو فلم پھر اسی نے ریلیز کی ہو گی۔

پاکستان کی سیاست میں شہباز شریف کی دوبارہ ملک بدری کے چند گھنٹوں بعد ہی اسلام آباد میں مختلف مسلم لیگی دھڑوں کے انضمام کے حق میں اعلان کے بعد چوہدری شجاعت حسین کو متفقہ طور پر صدر منتخب کر لیا گیا ہے ان اطلاعات کے تناظر میں ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ چوہدری شجاعت اور وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کے باہمی اختلافات ختم ہو گئے ہیں تاہم میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ صرف تین ہی روز پہلے چوہدری شجاعت کی طرف سے میر ظفر اللہ خان جمالی کی متحدہ مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل شپ کیلئے امید کی خواہش پر سخت تنقید آئی تھی۔ جمالی صاحب کی اس موو کو کسی بھی طاقتور حلقے نے پسند نہیں کیا تھا کہ وہ سیکرٹری جنرل کی سیٹ سنبھال کر پیر پگاڑا کے ساتھ مل کر کسی لمحے اس مضبوط اور طاقتور متحدہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر ایک سیاسی ہل چل اور اشتعال پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ تین روز قبل لاہور میں مسلم لیگیوں کے اجلاس میں جمالی اور پیر پگاڑا دونوں کے خلاف بات ہوئی تھی۔ چوہدری پرویز الٰہی نے کہا کہ کئی اراکین اسمبلی وزیراعظم کو سیکرٹری جنرل بنانے کی سازش کر رہے ہیں۔

میں وضاحت کرتا چلوں کہ لاہور میں دو روز قبل ہونے والے اجلاس میں جمالی

صاحب کی سیکرٹری جنرل کی حمایت کرنے والوں میں وزیر اطلاعات ونشریات شیخ رشید بھی تھے۔ اس اجلاس میں کی گئی تقاریر کے بعد مسلم لیگ فنکشنل یعنی پگاڑا گروپ کی طرف سے نام لئے بغیر مطالبہ ہوا کہ جمالی اور پیر پگاڑا پر تنقید کرنے والوں کو مسلم لیگ سے نکال دیا جائے۔ یہ سب مسلم لیگی اتحاد جس فارمولے کے تحت ہو رہے ہیں وہ ایک ممتاز ماہر قانون دان ایس ایم ظفر کے نام سے منسوب ہے اور ایس ایم ظفر فارمولا کہلایا جاتا ہے جو ایک ایسی مضبوط حکومتی جماعت تشکیل دینے کی خواہش رکھتے ہیں کہ حتمی طور پر اگر صدر پاکستان وردی چھوڑنے کے بعد سیاست میں آنا چاہیں تو وہ اس کی قیادت سنبھال سکتے ہیں۔

اب بات کرتے ہیں ملک کے ممتاز قانون دان اور سینیٹر ایس ایم ظفر سے۔

☆☆ جو مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں کا اتحاد ہوا اور کہا جاتا ہے کہ یہ ایس ایم ظفر فارمولے کے تحت ہوا ہے ہمیں بتائیں کہ ایس ایم ظفر فارمولا کیا ہے؟۔

☆☆ اب تو یہ واقعی ایس ایم ظفر فارمولا ہی ہے لیکن یہ فارمولا یوں بنا کہ بہت ساری سیاسی جماعتوں کی ضروریات اور ان کے اپنے مطالبے تھے ان میں کئی آئینی اور قانونی مشکلات تھیں۔ اس پر کافی بحث ہوئی اور تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین نے کئی میٹنگز کیں اور اس کے نتیجے میں یہ فارمولا بنا جس میں ظاہر ہے کہ میرا ہاتھ سب سے زیادہ تھا اس لئے اس کو یہ نام دے دیا گیا۔ اس فارمولے میں پہلی بات یہ دیکھی گئی کہ یہ اتحاد آئین کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتا ہے کہ نہیں اور جب آئین کو اچھی طرح پڑھا گیا اس کے آرٹیکلز کو دیکھا گیا تو صرف ایک ہی آرٹیکل ہے 16-3/A جو کہ انتشار کو روکتا ہے سیاسی وفاداریوں کو تبدیل کرنے سے روکتا ہے لیکن اگر سیاسی جماعتیں اکٹھی ہونا چاہیں تو ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ دوسرا مسئلہ یہ آتا ہے کہ سیاسی جماعتیں اکٹھی کیسے ہوں اس لئے ظاہر ہے کہ جب سیاسی جماعت بنانے کا حق لوگوں کو ہے اور جب ایک کونسل

بنالیتے ہیں یا آئین بناتے ہیں تو ہر آئین میں اپنے وجود کو ختم نہیں کر سکتے چنانچہ بات طے کی گئی کہ تمام کونسلیں جو اکٹھی ہونا چاہتی ہیں وہ اپنی اپنی سیاسی جماعتوں میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم ایک بڑے اتحاد کیلئے اور ملک کی بہتری کیلئے اکٹھے ہونا چاہتے ہیں تو یہ ایک مثبت اقدام ہے اور ایک اچھی بات یا اچھی سوچ ہے۔ اس کو سیاستدان بھی پسند کریں گے اور عوام کیلئے بھی یہ بات درست ہوگی اور ملکی سیاسی کلچر کے لحاظ سے صحیح صورتحال ہوگی۔ پہلے وہ اپنے تشخص اور اپنے آپ کو تحلیل کریں لیکن ساتھ ہی ایک اور آئین جو پاکستان مسلم لیگ قائداعظم کا آئین تھا اس کو بنیاد بنا کر آگے چلا جائے۔ جب قائدین نے بتایا کہ اس میں اس قسم کی تبدیلیاں ہونی چاہئیں تو پھر اس آئین میں وہ بتدیلیاں لائی گئیں کیونکہ جب ہم آئین بنانے بیٹھتے ہیں تو بہت اچھا بناتے ہیں لیکن کسی بھی آئین پر کسی حکومت نے کبھی بھی نیک نیتی سے عمل نہیں کیا۔ یہ ہمارے اندر بہت بڑی خرابی ہے اس کو درست کرنا پڑے گا۔

13 مئی 2004ء

برف پگھلے گی

ابھی ڈیڑھ ماہ ہی گزرا ہے جب سرحد پار برادر اسلامی ملک ایران میں آنے والے زلزلے سے 43 ہزار انسان لقمہ اجل بن گئے تھے اور اس سے بہت بڑی تعداد میں لوگ شدید زخمی اور اپاہج ہوئے تھے۔ پھر چند روز پہلے ہی ہم نے شارجہ میں ایرانی طیارے کی تباہی کی خبر سنی تھی جس میں وطن واپس جانے والے ایرانی محنت کش مارے گئے تھے۔ اندرون ملک سیاسی بحران کا شکار ایران اس وقت شدید عالمی دباؤ میں ہے، جنوبی عراق کی صورتحال، ایٹمی تنصیبات کے حوالے سے تنازعہ اور دو روز بعد ملک میں ہونے والے الیکشن نے پہلے اصلاح پسندوں اور شدت پسندوں کے درمیان تصادم کے باعث عوام کی واضح طور پر دو گروہوں میں تفریق اور تقسیم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد آج رونما ہونے والا ایک اور حادثہ جس میں 200 افراد ہلاک ہوئے ہیں ایندھن اور کیمیکل لے جاتے ٹرین کے ڈبے جس دھماکے سے پھٹے اس کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ آس پاس کے پانچ گاؤں بھی بھڑکنے والی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ چھوٹے چھوٹے مٹی سے بنے مکانات راکھ بن گئے اور 400 کے قریب افراد شدید زخمی حالت میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرنے والوں کی مغفرت فرمائے اور جو زخمی ہیں، تکلیف میں ہیں، ان پر

اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ ایران سے اوپر شمال کی طرف بھی صورتحال کچھ اچھی نہیں ہے افغانستان کی برف سے ڈھکی آسمانوں سے باتیں کرتی چوٹیاں چند ہی روز میں موسم بہار کو خوش آمدید کہنے کیلئے اپنا سفید لباس اتارنا شروع کر دیں گی۔ پتھریلی ڈھلوانوں پر بہتے چشموں میں تیزی آجائے گی اور منجمد ہو کر دم توڑ دینے والے ننھے پودے دوبارہ مسکرا کر آنکھیں کھولیں گے اور اپنے دامن میں خوش رنگ پھولوں کو بسانا شروع کر دیں گے۔

خاموش برفانی چوٹیوں میں کئی میزائلوں، بموں اور گولیوں کی گونج ابھرنے کو ہے۔ بلبلوں اور کوئلوں کے برعکس مردار خور گِدھ ابھی سے فضاؤں میں گردش کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ چشموں کا صاف شفاف پانی سرخ ہونے کو ہے اور پہاڑی نغمے چیخوں اور آہوں کا روپ دھارنے والے ہیں ایک نیا میدانِ جنگ شاید آخری معرکے کا روپ اختیار کرنے جا رہا ہے اور دو افغان خود کو افغان تاریخ میں امر کر دینے کا عزم لئے اپنے ساتھیوں کو سمجھا رہے ہیں کہ اگرچہ شکست اور موت یقینی ہے لیکن آخری دم تک لڑنے کا عہد نہ توڑنا۔

یہ دو افغان خوست صوبے سے کمانڈر جلال الدین حقانی اور مشرقی صوبے کنڑ سے حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار ہیں۔ ان دونوں کمانڈرز کو پاک افغان سرحد پر موجود قبائل کی حمایت حاصل ہے۔

بیشتر سرداروں کی طرف سے یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اگر اس آخری معرکے میں وہ ان دونوں کا ساتھ نہ بھی دے سکے تب بھی نیوٹرل ضرور رہیں گے، جلال الدین حقانی کو یقین ہے کہ کئی سینئر افغان کمانڈر بشمول سیف اللہ منصور ان کے ہراول دستے میں دشمن کو بھاری نقصان پہنچانے کو تیار ہیں، حکمت یار اور ان کے سب سے قریبی رفیق انجینئر کشمیر خان نے کنڑ کے ایک اجلاس میں طے کیا ہے کہ آئندہ چند روز میں امریکیوں پر خود کش حملوں کی تعداد بڑھا دی جائے گی اور نشانہ امریکی افواج اور نیٹو کی افواج کے علاوہ وہ غیر ملکی

ادارے بھی ہوں گے جو کسی نہ کسی شکل میں افغان سرزمین پر موجود ہیں اور پہلی بار طالبان افغان سرزمین پر مختلف دور دراز ممالک سے آنے والے جنگجو اور گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی ایک مشترکہ جنگ لڑنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یا حکمت عملی خود کو امریکی بمبار طیاروں سے آتش و آہن کی برستی بارش سے بچانا ہے۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ نیٹو کی افواج اس مشرقی سرحد کے پار جمع ہو رہی ہیں یعنی پاکستان کی طرف جہاں شمالی وزیرستان کی ایجنسی کا علاقہ ہے۔ اور جہاں میران شاہ کے اردگرد علاقے میں خصوصی انٹیلی جنس آلات نصب ہو چکے ہیں۔ یہ تمام نیٹو افواج خوست اور کنٹر پر کسی بھی وقت دھاوا بولنے جا رہی ہیں تاکہ موسم سرما کے اختتام پر کارروائیاں کرتے جنگجوؤں کو تیاری کے مرحلے پر کہیں دبوچ لیں اور ظاہر ہے یہی وہ ضرورت ہے جو امریکہ کو اسلام آباد کے ایوانوں کے دروازے تک لے آئی ہے۔

پاکستان کے قبائلی میران شاہ سے چند سرداروں نے خوست کے نزدیک پہنچ کر امریکہ کی طرف سے جلال الدین حقانی کو ایک پیش کش کی ہے کہ اگر وہ اپنے ہتھیار پھینک دیں تو افغانستان کے اگلے سیاسی سیٹ اپ میں انہیں ایک اہم کردار دیا جا سکتا ہے۔

جلال الدین حقانی نے اس سمجھوتے سے انکار کیا ہے لیکن ملاقات کروانے والے پرامید ہیں کہ وہ حقانی کو اس سمجھوتے کی طرف لا سکتے ہیں۔

میران شاہ سے جانے والے اسی وفد نے حزب اسلامی والوں سے بھی ملاقات کر کے گلبدین حکمت یار کو بھی صلح کا پیغام دیا ہے۔

حکمت یار کو شراکت اقتدار کے علاوہ ان کے داماد ڈاکٹر غیرت بشیر کو رہا کرنے کی بھی پیشکش کی گئی ہے ڈاکٹر غیرت بشیر اسلام آباد میں مقیم تھے جہاں وہ حکمت یار کے ترجمان کے علاوہ حزب اسلامی کے سیاسی ونگ کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے انہوں نے حکمت یار کی

طرف سے طالبان کے ساتھ 2001ء کے آخر میں امریکہ کے خلاف لڑنے کا سمجھوتہ دستخط کیا تھا جس کے بعد حساس اداروں نے انہیں گرفتار کر کے کابل کے نزدیک بگرام ایئر بیس پر پہنچا دیا تھا۔ یہ واضح نہیں کہ ڈاکٹر بشیر اب بھی بگرام ایئر بیس میں ہیں یا نہیں۔ یا انہیں 2002ء کے آغاز میں کسی وقت گوانتانا موبے پہنچا دیا گیا تھا۔

حکمت یار نے اب تک صلح کی اس پیشکش کا حتمی جواب نہیں دیا لیکن یہ طے ہے کہ اگر حکمت یار نے اس مرحلے پر ہتھیار پھینک کر افغانستان میں موجود سیاسی ڈھانچے کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا تو قندھار، جلال آباد اور کنٹر وادیوں میں موجود مورچہ بند کمانڈوز بھی ہتھیار پھینک سکتے ہیں۔

یہ تمام وادیاں حکمت یار کے زیر اثر ہیں۔ حکمت یار کے طاقتور جماعتی شمالی افغانستان میں بھی ہیں اور خود کابل میں حامد کرزئی کی انتظامیہ کے کئی اہم اراکین بھی حکمت یار کے وفادار ہیں۔

یہ وہی گلبدین حکمت یار ہے جو ایک دور میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران امریکہ کا پسندیدہ ترین افغان مجاہد تھا اور 57 سالہ انجینئر اگر ہتھیار پھینکنے سے انکار کرتا ہے تو آنے والا یہ خونی معرکہ پورے افغانستان کو اپنی لپیٹ میں لینے کے علاوہ پاکستانی سرحد کے اس پار تک پھیلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اس وقت افغان سرزمین پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے 13 ہزار فوجیوں کے علاوہ نیٹو ممالک کے ساڑھے پانچ ہزار فوجی کابل کے اردگرد موجود ہیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اس آخری معرکے کی نوبت آتی ہے یا اس سے پہلے بھی کوئی معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ اور خود امریکی اس وقت جس باغیرت شخص کو تلاش کر رہے ہیں وہ انہیں مل پاتا ہے یا نہیں۔

افغان چوٹیوں پر ہی برف پگھلنا اہم نہیں۔ یہ برف کشمیر کے پہاڑوں پر بھی پگھلے گی اور موسم سرما میں اسلام آباد میں گفتگو کا آغاز ہوگا۔ مئی جون کے گرم موسم میں دونوں ممالک سیکرٹری خارجہ کا اجلاس منعقد کروا رہے ہیں یہ وہ وقت ہوگا جب بھارت میں الیکشن کے بعد ایک نئی حکومت برسر اقتدار آ چکی ہوگی اور اس سے پہلے بھارتی کرکٹ ٹیم 15 سال بعد پاکستانی سرزمین پر آٹھ میچ کھیل کر جا چکی ہوگی۔

ٹریک ٹو یا پسِ چلمن سفارتکاری کرنے والوں کو یقین ہے کہ اب جو سلسلہ آگے چلا ہے اسے روکنا مشکل ہوگا اور یہ کسی حتمی فیصلے تک ضرور پہنچے گا۔

19 فروری 2004ء

کہانی کہیں سے بھی شروع ہو وہ اختتام ہی کی طرف بڑھتی ہے

آج آپ کو ماضی قریب کی ایک کہانی سناتے ہیں۔اس کے کردار و واقعات بھی جیتے جاگتے مختلف بھیس بدلے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔شاید آپ کو کچھ گمان سا نظر آئے۔کہانی کہیں سے بھی شروع ہو وہ اختتام ہی کی طرف بڑھتی ہے۔اختتام ہی اہم ہوا کرتا ہے اور اختتام پر ہی نظر رکھنی ضروری ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جن کہانیوں کے کردار انجام سے،اختتام سے بے خبر رہتے ہیں عموماً ان کے کرداروں کو ایک غیر متوقع اینڈ دیکھنا پڑتا ہے۔

لندن کے مصروف علاقے ماربل آرٹس کی سی من سٹریٹ ہمیشہ سے مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے تارکینِ وطن کا مرکز رہی ہے۔یہاں کی دکانیں آپ کو لبنان عراق، کویت اور دیگر خلیجی ممالک کے باشندوں سے بھری نظر آتی ہیں اور ہوٹلز روایتی مینوز جیسے چلو کباب،قورمہ،چکن رائس،چکن شاشلک جیسے روایتی کھانوں سے لطف اندوز ہونے والوں سے جبکہ ہوٹلوں کے باہر رکھی کرسیاں ادھیڑ عمر کے قہوہ کی چسکیاں بھرتے،حقہ پیتے،بحث مباحثہ کرتے لوگوں سے بھری نظر آتی ہیں۔یہیں 18 ویں صدی کی تعمیر شدہ ایک عالی شان عمارت ہے۔اتوار 10 جون 2001ء کی شام ہوٹل کے منیجر نے کمرہ نمبر 15 کے دروازے پر بار بار دستک دینے کے باوجود اندر سے کوئی جواب نہ پایا تو اس نے Master Key سے کمرہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔اندر موجود 31 سالہ مہمان خاتون کئی گھنٹوں سے بستر پر مردہ پڑی تھی۔پولیس کو کمرے سے 16 قسم کی خطرناک نشہ آور ادویات ملیں جن میں کوکین بارلی کون

48 ملی گرام کی مقدار میں پائی گئی۔ عموماً چھ ملی گرام پر انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ہوٹل کے ملازمین نے پولیس کو بتایا کہ یہ عورت پچھلے کئی ماہ سے اسی کمرے میں مقیم تھی۔ شام ہوتے ہی بے تحاشا شراب پی کر نشے میں خود کو غرق کر لیتی اور سونے کے لیے نیند کی طاقت ور ادویات استعمال کرتی۔ ملازمین کا کہنا تھا کہ اس نے زیادہ طاقت کی گولیاں کئی بار وافر مقدار میں کھالیں اور ہم نے اس عورت کو کئی بار معدے کے درد میں تڑپتے اور پھر خون اگلتے دیکھا۔ ایک مقامی ڈاکٹر نے پولیس کو بتایا کہ تین ماہ پہلے یہ عورت مجھ سے ملاقات کے دوران میز سے نشہ آور ادویات کے نسخہ جات چرا کر بھاگ گئی۔ چنانچہ اس عورت نے تین ماہ میں ذہنی سکون کے لئے ان خطرناک ادویات کی ایک ہزار گولیاں استعمال کیں۔ معائنے کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ کئی مرتبہ زیادہ مقدار میں گولیاں کھا لینے کے باوجود یہ عورت ایک دم موت کی آغوش میں نہیں گئی۔ یہ عالمِ غنودگی میں بھٹکتی رہی، تڑپتی رہی، روتی رہی آہیں بھرتی رہی، اور غالباً چلاتی اور کسی کو پکارتی رہی اور پھر رفتہ رفتہ کئی گھنٹوں پر محیط اس منزل سے گزرنے کے بعد اس نے دم توڑ دیا ہوٹل کا مینیجر کئی ماہ سے واجب الادا بل کے لئے پریشان کھڑا تھا اور پولیس لاش کی مکمل شناخت کے بعد اس کے لواحقین تک اس سانحے کی اطلاع پہنچانے کے لئے بے تاب تھی۔ ہوٹل کے اس کمرے کی تفصیلی تلاشی شروع کی گئی۔ اس ہوٹل کے دراز سے عورت کے بچپن کی تصویر برآمد ہوئی۔ کئی برس پہلے جب وہ ایک خوبصورت سی چھوٹی سی بچی تھی۔ قیمتی لباس میں ملبوس دنیا بھر کی مسرتیں خوشیاں اس کے چہرے سے عیاں تھیں اور وہ اپنے بارعب باپ کی گود میں ایسے بیٹھی تھی جیسے اس کے اشارے سے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے گی۔ تصویر میں موجود چہرے پہچان لئے گئے یہ عورت جو ہوٹل کا بل ادا نہ کر پائی تھی جس پر ہر شام اداسی کے لمبے دورے پڑ جاتے اور جو بے تحاشہ شراب پی کر دیواروں کو خواتین سمجھ کر حکم جاری کرتی اور پھر غصہ سے

چیختی کہ اب دیواریں بھی کیوں اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ یہ بدقسمت عورت ایران پر طویل حکمرانی کرنے والے شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی لیلیٰ پہلوی تھی۔ اس بادشاہ کی بیٹی جس نے جب ڈھائی ہزار سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا تو ماہرین نے تاریخ کی کتابیں کھنگال کر بادشاہ کو بتایا کہ عالی جاہ ایران میں بادشاہت کو ڈھائی ہزار سال نہیں بلکہ ایک ہزار چار سو پندرہ سال گزرے ہیں۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ ایران میں کیلنڈر کو ایک ہزار پینتیس برس آگے کر دیا جائے اور اس حکم کی انہوں نے تعمیل بھی کر دی۔

ایک روز بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ کیا ٹائم ہوا ہے وزیر نے جواب دیا کہ حضور چھ بجے ہیں۔ بادشاہ نے جھنجھلا کر دوسرے وزیر سے پوچھا تو اس نے بھی یہی وقت بتایا تو بادشاہ نے غصے سے کہا کہ میری گھڑی پانچ بجا رہی ہے۔ اس نے گھڑی اتار کر وقت درست کرنے کی کوشش کی تو وزیر عباس رضا نے چلا کر کہا کہ حضور یہ آپ کیا کر رہے ہیں آپ کے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ گھڑی کو اسی طرح رہنے دیں پینتیس ملین ایرانی عوام اپنی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر لیں گے۔ اس نے حکم دیا تو ایران میں موجود چوالیس ہزار امریکی سفارتکار قرار دے دیئے گئے۔ دوسرا حکم دیا تو داڑھی پر پابندی لگا دی گئی۔ بادشاہ کو تاریخ کا عادل ترین بادشاہ قرار دیا گیا۔ بادشاہ کی تاج پوشی کی سالگرہ پر 165 باورچی فرانس سے خصوصی طیارے کے ذریعے ایران لائے گئے اور بس کھانے کی دعوت کا خرچہ 60 ملین ڈالرز تھا۔ اس بادشاہ کی لاڈلی بیٹی لیلیٰ پہلوی نے آخری لمحات میں شاید یہ بھی سوچا ہو کہ ایسا ہی کوئی وقت اس کے باپ پر بھی گزرا جو 1979ء میں اپنے خاندان کے ساتھ انقلاب آنے کے بعد ایران سے فرار ہو کر پہلے امریکہ اور پھر در در کی ٹھوکریں کھاتا ملک ملک گھومتا رہا تھا۔ جہاں جاتا چند ہی روز میں وہاں کی حکومت اسے نکل جانے کا حکم دیتی۔ بادشاہت ختم اور سوئٹزرلینڈ میں پڑے ملین ڈالرز ضبط اور پھر ہر دم موت کی طرف بڑھتا رضا شاہ پہلوی

امریکہ سے گھانا وہاں سے میکسیکو اور پھر قاہرہ تک پہنچا تھا کہ وہاں پر ایک معمولی سے مکان میں فرح دیبا کی سسکیوں اور اپنی بادشاہت کی بوسیدہ یادوں کے ساتھ اس طرح دم توڑ دیا کہ دو چار لوگوں نے اسی مکان کے صحن میں اسے دفن کر دیا۔

لیلیٰ اس وقت باپ کے ساتھ نہ تھی لندن کے ہوٹل میں دم توڑتی لیلیٰ پہلوی شاید آخری لمحات میں جنوبی تہران کے پوش محل میں ہنستی کھیلتی دوڑتی بھاگتی رہی ہو جہاں اس کے باپ نے اس کی دلچسپی کے لئے چڑیا گھر تعمیر کیا تھا اور وہاں شیروں، چیتوں اور بندروں کے علاوہ اندرا گاندھی کی طرف سے دیا گیا تحفہ شاید ہاتھی کی صورت میں موجود تھا۔ باپ کی موت کے بعد ماں فرح دیبا بچوں کو لے کر امریکہ چلی گئی لیکن لیلیٰ کا ذہن پیچھے کہیں اپنے محل کے باغیچوں اور اپنے ہاتھی دوست میں ہی اٹکا ہوا تھا وہ کبھی عام زندگی نہ گزار سکی اور رفتہ رفتہ نشے میں ڈوبتی چلی گئی اور فرح دیبا آج بھی کہیں امریکی شہر میں تنگدستی کی زندگی گزار رہی ہے۔ زندگی مشکل ہے لیکن موت سے پہلے جتنی سانسیں لکھی ہیں وہ شوہر اور بیٹی کی یاد میں گزارنا آسان نہیں۔ دنیا میں شاید کتنے ہی بادشاہ اور شہزادیاں گزری ہیں جن کو اپنے اقتدار پر مان تھا جو سورج کو رک جانے اور ہوا کو چھڑ جانے کا حکم دیا کرتے تھے۔ خود کو مقدس سمجھتے اور لوگوں کے سانسوں کی گنتی کیا کرتے تھے۔ ہماری اپنی تاریخ بھی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہیں اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہی لوگ پھر گلی گلی کشکول پکڑے پھرتے رہے اور لقموں کو ترستے رہے لیکن یہ انسان بھی کمال کی مخلوق ہے۔ یہ پرانے حکمرانوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر اپنا تاج پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا اقتدار قیامت تک برقرار رہے گا اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ برف کا ایسا گولا ہے جسے قدرت کسی بھی لمحے صحرا میں پھینک سکتی ہے۔

14 اپریل 2004ء

ایک طالب علم کا سوال

الیکشن کمیشن نے کراچی کے ضمنی انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا ہے کیونکہ متحدہ مجلس عمل کی طرف سے الیکشن کمیشن سے اس الیکشن کو کالعدم قرار دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ انتخابات کے روز کراچی میں بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری ہوئی تھی۔ ایم کیوایم اور متحدہ مجلس عمل کی طرف سے ایک دوسرے پر شدید الزامات عائد کئے گئے تھے۔ الیکشن کمیشن کا یہ فیصلہ صوبے اور ملک کی سیاست میں کیا اہمیت رکھتا ہے آنے والا وقت بتائے گا۔ آج ہم ایک الگ موضوع کی طرف چلتے ہیں ایک طالب علم کا سوال ہے کہ آج کل بوہرہ جماعت کی روحانی شخصیت سیدنا برہان الدین کی سالگرہ کی تقریبات منعقد ہو رہی ہیں لیکن اس جماعت کی کوئی باقاعدہ مستند تاریخ اب تک سامنے نہیں آئی براہِ کرم کچھ بتائیں کہ کیا بوہری جماعت اسماعیلی مسلک سے ہی تعلق رکھتی ہے یا یہ اہل تشیع حضرات ہیں کیونکہ ان کے ہاں بھی محرم کی مجالس ہوا کرتی ہیں۔

میں ناظرین کی معلومات کیلئے سوال کا جواب یوں دینا چاہوں گا کہ جی ہاں بنیادی طور پر بوہری حضرات شیعہ مسلک سے ہی تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے دیگر اختلافات سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ذرا سلسلہ امامت پر نظر ڈالیں۔ اہل تشیع میں آغازِ امامت حضرت علیؓ سے ہوئی ہے۔ پھر دوسرے امام حضرت حسنؓ تیسرے سید الشہداء امام حسینؓ چوتھے حضرت امام علی زین العابدینؒ پانچویں امام باقرؒ چھٹے امام جعفر صادقؒ کے بعد مسئلہ امامت پر اختلاف پیدا ہوگیا۔

امام جعفرؒ کے سات بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؒ، حضرت عبداللہؒ اور تیسرے نمبر پر حضرت موسیٰ کاظمؒ ان تینوں شخصیات نے امامت کا دعویٰ کیا۔ جن حضرات کا کہنا تھا کہ حضرت اسماعیلؒ امام جعفر صادقؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں اور امام باقرؒ نے کیونکہ ان کی امامت پر نص کی تھی اسی لئے وہ امام ہیں، وہ اسماعیلی فرقے کے طور پر سامنے آگئے۔ باقی حضرات جن کا کہنا تھا کہ حضرت اسماعیل کا انتقال ان کے باپ کی موجودگی میں ہی ہوگیا تھا اس لئے امامت حضرت موسیٰ کاظم کی طرف منتقل ہوگئی وہ باقی شیعہ حضرات یعنی اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ چنانچہ چھٹے امام کے بعد باقی شیعہ جماعت سے راستہ الگ کر لینے والے اسماعیلی حضرات کہلاتے ہیں۔ حضرت اسماعیل کو اپنا امام تسلیم کر لینے والے یہ مسلمان یعنی بنو فاطمہ شمالی افریقہ کے علاوہ دو سو سال تک مصر پر بھی حکومت کرتے رہے اور ان کے دور میں علم و فن کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بنو فاطمہ میں تیرہ خلیفہ گزرے ان کے پیش نظر اہم ترین مقصد یہ تھا کہ وہ بغداد میں موجود سنی عباسی خلافت کا خاتمہ کر سکیں۔ دسویں صدی کے آخر تک بنو فاطمہ کا مرکز مصر تھا اور وہ یمن کے وسیع علاقے پر اپنا مضبوط حلقہ اثر بھی قائم کر چکے تھے۔ بنو فاطمہ نے مصر میں ایک نیا دارالحکومت قائم کیا۔ جس کا نام قاہرہ ہے۔

یہ 969ھ کا واقعہ ہے اور پھر اگلے ہی سال اسماعیلی بنو فاطمہ نے ایک اہم مسجد تعمیر کی جو آج بھی جامعہ اظہر کہلاتی ہے۔ اس دوران عباسی اور فاطمی خلافتوں کے درمیان کئی خونی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ بنو فاطمہ کے ساتویں خلیفہ جو کہ اسماعیلیوں کے اٹھارویں امام تھے ان کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی پر خود بنو فاطمہ میں جھگڑا اور اختلاف ہوگیا۔ خلیفہ کے وزیر جن کا نام افضل تھا انہوں نے خلیفہ کے چھوٹے بیٹے مستصالی کو نیا جانشین مقرر کر دیا جبکہ خلیفہ کے بڑے بیٹے نضار نے مستصالی کی امامت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے خود امامت کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ یہاں سے اسماعیلیوں کی دو شاخیں ہوگئیں۔ نضار نے مصر سے بھاگ کر سکندریہ میں اپنی حکومت قائم کر لی جس کے مقابلے پر مستصالی نے اپنی فوج وہاں بھیجی اور نضار کو گرفتار کر کے قاہرہ لے جایا گیا جہاں مستصالی نے نضار کو دو دیواروں میں چنوا دیا۔ یا اسے قید کر دیا گیا اور وہ وہیں پر 490ھ میں انتقال کر گئے۔ نضار کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوگئی کیونکہ انہیں قتل کر دیا گیا لیکن ان کے حامیوں نے اپنی دعوت جاری رکھی اور نضاری حکومت قائم کر لی جو اگلے ڈیڑھ سو سال تک قائم رہی۔

مستصالی اور نضار کی اس جنگ میں اسماعیلی حضرات دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہندوستان میں جو لوگ نضار کے حامی ہیں اسماعیلی کہلاتے ہیں اور جو مستصالی کے ہمنوا ہیں وہ بوہرہ کہلاتے ہیں۔ بوہرہ دراصل گجراتی بھورہ سے نکلا ہے جس کے معنی تاجر یا سوداگر کے ہیں کیونکہ اس فرقے میں اکثریت تجارت پیشہ حضرات کی تھی اس لئے یہ بوہرہ کہلاتے تھے۔ دوسری طرف وہ اسماعیلی جو نضار کے ماننے والے تھے انہوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ اس حکومت کے نویں حکمران رکن الدین شاہ کے دور میں جو کہ نضاری اسماعیلی حضرات کے ستائیسویں امام تھے اس کو تاتاریوں نے تاراج کر دیا اور رکن الدین کو قتل کر دیا جس کے بعد وہاں نضاری حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور امامت کا مرکز ایران ہوگیا۔ جہاں ان کے اٹھارہ مزید

امام تھے یعنی سلسلہ امامت 45ویں امام تک جا پہنچا۔

نصاری اسماعیلیوں کے 45ویں امام خلیل اللہ ایران میں ایک شورش کے دوران قتل ہوگئے اور وہاں ہنگامے پھوٹ پڑے اس کے بعد ایران کے بادشاہ فتح علی تاتار نے قاتلوں کو پکڑ کر سزا دینے کے علاوہ خلیل اللہ جن کا قتل ہوگیا تھا ان کے دوسالہ بیٹے حسن علی کے ساتھ اپنی بیٹی سروری جہاں خانم کی شادی کردی۔ اس کے علاوہ انہیں آقا خان کا شاہی خطاب بھی دیا جو کہ بعد میں آغا خان کہلانے لگا۔ اس طرح اسماعیلیوں کے چھیالیسویں امام یعنی حسن علی آغا خان اول کہلانے لگے۔ یہ جو لفظ ہے آقا یا آغا یہ ایران میں ترکی سے آیا جہاں سلطنت عثمانیہ میں اس کا مفہوم مالک کے طور پر لیا جاتا تھا۔ لفظ خان بھی ہمارے ہاں پٹھانوں کے علاوہ ترکی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور خان کے لقب کو مالک اور امیر پر فوقیت دیتے تھے۔ ہندوستان میں بھی ایک دور میں خان افغان یا ایران سے آنے والا وہ کمانڈر کہلاتا تھا جس کے ماتحت دس ہزار فوج ہوتی تھی۔ اس کے بعد مالک ہوتا تھا جس کے ماتحت ایک ہزار فوج اور پھر امیر تھا جس کے ماتحت ایک سو فوجی ہوتے تھے۔ افغانستان میں کئی سو سال تک لفظ خان استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور افغانوں نے خان کا لفظ استعمال کرنا تب شروع کیا جب دہلی کے حکمرانوں نے اپنے افغان حمایتیوں کو خان کا خطاب دینا شروع کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ جس طرح ترک حکمرانوں نے آغا لفظ کے ساتھ بیگ لگا کر آغا بیگ کے القاب دیئے اسی طرح ایران میں آغا کے ساتھ لفظ خان لگا کے آغا خان خطاب عطا کیا گیا۔

آغا خان اجمل کا اپنے سسر یعنی بادشاہ فتح علی تاتار کے انتقال کے بعد ایران میں رہنا دشوار ہوگیا اور اسی لئے وہ 1842ء میں ہندوستان آگئے اور بمبئی میں انہوں نے سکونت اختیار کر لی۔

یاد دلاتا چلوں کہ تمام اسماعیلی حضرات وہ ہیں جو مستنصر کے صاحبزادے نضار جنہیں قتل کر دیا گیا تھا ان کو مانتے ہیں۔ جو ہندوستان میں آغا خان کے آنے سے پہلے بس رہے تھے وہ پونجا اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ جن کے خاندان میں خود قائداعظم محمد علی جناح نے بھی آنکھ کھولی تھی۔ جب بعد میں آغا خان ہندوستان آ کر اس جماعت کے سربراہ بن گئے تو پھر وہ اسماعیلی آغا خانی کہلانے لگے۔ تاریخ پاکستان کی ممتاز شخصیات کے مطابق قائداعظم محمد علی جناح نے ایک مرتبہ انہیں بتایا تھا کہ جب وہ اکیس سال کے تھے تو انہوں نے اسماعیلی مذہب چھوڑ کر اثنا عشری کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سیدنا برہان الدین 1965ء سے بوہرہ جماعت کے رہنما ہیں۔

10 جون 2004ء

مسٹر پی ایم تاریخ ہمیشہ سنگدل ہوا کرتی ہے

آپ نے کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ گزرے زمانوں میں کبھی کبھار بحری سفر پہ نکلنے والے جہاز رستے میں طوفانوں میں گھر جاتے، موجیں تلوار کی دھار بن کر انکو چیر دیتیں یا پھر کوئی شہزادہ، شہزادی یا کہانی کا کوئی بھی بہادر کردار لکڑی کا بہتا ہوا ایک تختہ سنبھال کر تیرتا ہوا کسی غیر آباد جزیرے میں جا نکلتا اور باقی زندگی وہیں فطرت کی آغوش میں بسر کر دیتا کچھ کہانیوں میں جزیرے پر زندگی گزارتے جنگلی جانور اس کے دوست بن جاتے اور کچھ کہانیوں میں وہاں آباد کوئی آدم خور جنگلی قبیلہ اس کی خاطر تواضع کیلئے آ دھمکتا جس سے نبرد آزما ہونے کی دشواریاں کہانی کو آخری موڑ تک دلچسپ بنائے رکھتیں۔ کچھ کہانیوں میں یہ بھی ہوتا کہ اس غیر آباد جزیرے پر کہانی کے کردار کے علاوہ کوئی بھی ذی نفس نہیں ہوتا اور وہ کئی روز تک ساحل پر آگ جلا کر اس کے دھوئیں سے قریب سے گزرتے بحری جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور آخر کار اس میں کامیاب ہو کر اپنے گھر واپس لوٹ جاتا۔

اس قسم کی کسی کہانی میں بحری سفر پر جاتا ایک ماہر مجسمہ ساز اور اس کا بیٹا اپنے جہاز کے تباہ ہونے کے بعد لکڑی کے تختوں پر تیرتے ایک جزیرے پر آ نکلے کیونکہ وہاں کرنے کو کچھ نہ تھا اس لئے مجسمہ ساز ایک بڑی سی چٹان کونو کیلے پتھروں کی ہتھوڑی بنائے ایک

خوبصورت مجسمہ تراشنے لگا۔اس کا بیٹا اس دوران ساحل پر آگ جلا کر جہازوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا اسی طرح کئی ماہ گزر گئے اور رفتہ رفتہ مجسمے کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ایک روز مجسمہ ساز مجسمے پر پتھر رگڑ رہا تھا تو اس کا بیٹا بھاگتا ہوا آیا اور چٹان کے نیچے کھڑا ہو کر چیخنے لگا کہ ''بابا بھاگو سمندر کی طرف سے ایک خوفناک طوفان آ رہا ہے اور سب کچھ غرق ہونے والا ہے'' باپ نے ایک نظر بیٹے پر ڈالی اور پھر پلٹ کر تیزی سے مجسمے پر کام کرنے لگا۔اس کے بیٹے نے چٹان کے نیچے سے چیخ کر کہا کہ بابا میں اور آپ اس مجسمہ سمیت پانی میں ڈوبنے والے ہیں۔پھر آپ آخری لمحہ تک پتھر کیوں کھود رہے ہیں۔مجسمہ ساز نے تیزی سے اپنے ہاتھ چلاتے ہوئے اپنے بیٹے کو جواب دے کر کہا ''بیوقوف بچے میری خواہش ہے کہ صدیوں بعد بھی اگر زمین کبھی کروٹ لے اور اس جزیرے کا پانی اترے اور یہاں پھر درخت لہلہانے لگیں اور ایسے میں ہم سا کوئی بھولا بھٹکا مسافر یہاں اترے تو وہ اس مجسمے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے دکھ درد بھول جائے اور اس کے منہ سے بے اختیار اس مجسمے کے تخلیق کار کیلئے آفرین نکلے'' مجسمہ ساز کے اس رویئے سے وہ لوگ اتفاق کرینگے جو انسان کو مایوسیوں کے اندھیروں میں بھی اجالے دکھایا کرتے ہیں۔یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ہر جزیرے ہر ملک ہر حکومت ہر نظام ہر بستی نے ایک نہ ایک دن ڈوب جانا ہے،فنا ہو جانا ہے، مر جانا ہے غرق ہو جانا ہے،لیکن اگر منصف یہ بات ذہن میں رکھے کہ ایک دن تو ظالم اور مظلوم دونوں نے ہی مرنا ہے تو پھر عدالت سجانے اور قانون کی کتابیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔اگر فنا کی حقیقت سامنے رہے تو شاید ہی کوئی مصور تصویر بنائے،کوئی مجسمہ تخلیق ہو کوئی عمارت تعمیر ہو،کوئی سڑک پل،گلی،محلہ شاید ہی بنے اور ہر طرف یہ جو چہل پہل بھاگتی دوڑتی زندگی کے رنگ اس کی روشنی اور خوشبو اگر آتی ہے تو یہ کچھ بھی یہاں نظر نہ آئے۔لیکن یہ سب کچھ یہاں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ اسی بوڑھے مجسمہ ساز کی طرح خود کو

دی گئی مہلت کا ایک ایک لمحہ نقش ونگار کھودنے اور خدوخال بنانے پر یقین رکھتا ہے۔

ہمارے وزیراعظم چوہدری شجاعت حسین کو اپنے عہدے کا حلف اٹھائے 240 گھنٹے گزر چکے ہیں اس دوران انہوں نے دو نئے وزراء سمیت 27 رکنی کابینہ اور چار مشیروں سے حلف اٹھوایا۔ وزیراعظم ہاؤس میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں گندم کی قیمتیں کنٹرول کرنے کی ہدایات جاری کی ہیں۔ پھر ملک بھر سے مسلم لیگی عہدیداروں کا اجلاس وزیراعظم ہاؤس میں منعقد کیا ہے۔ سینٹ اور قومی اسمبلی میں تقاریر کی ہیں پھر وہ کراچی گئے ہیں جہاں انہوں نے وزیراعلیٰ سندھ ارباب غلام رحیم کے عشائیے میں شرکت کے علاوہ متحدہ قومی موومنٹ کے مرکزی دفتر کا بھی دورہ کیا ہے۔ وزیراعظم نے یہ بھی کہا ہے وہ 18 اگست تک اقتدار شوکت عزیز کے حوالے کر کے اس سے الگ ہو جائیں گے۔ اور انہوں نے اس مختصر مدت کیلئے جمالی کابینہ میں تبدیلی لائے بغیر یہ تنازعہ کھڑا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان سے ملاقات کرنے والا ہر شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ چوہدری شجاعت کی ذات میں عجز کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک دھیمے لہجے کے بردبار متین اور انتہائی ملن سار شخص ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مختصر سے عرصہ اقتدار میں ان کے دامن پر کوئی داغ نہ لگے کوئی ان پر انگلی نہ اٹھائے۔ کوئی انہیں برا نہ کہے یعنی جس طرح اقتدار کے 240 گھنٹے گزر گئے ہیں اسی طرح باقی 888 گھنٹے بھی بیت جائیں۔ مجھے یہاں چوہدری صاحب سے اختلاف ہے کیونکہ لوگوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کس نے کتنی دیر حکومت کی۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انہیں کس نے کیا دیا مجھے یقین ہے کہ چوہدری شجاعت حسین کے آس پاس مجسمہ ساز کے بیٹے جیسے طوفانوں اور بربادیوں کا اعلان کرنے اور اقتدار کے جزیرے کے جلد ڈوبنے کی خبر سنانے والے تو بہت سے لوگ ہوں گے لیکن چٹان کی آغوش سے خوبصورت نقش اور دل آویز خدوخال دریافت کرنے کیلئے اقتدار کے آخری لمحے تک آخری سانس تک جُت جانے کا

مشورہ دینے والا بھی وہاں کوئی موجود ہے کہ نہیں۔ وزیراعظم کو علم ہونا چاہیے کہ تاریخ بڑی سنگدل ہے اسے حکمرانوں کی ذاتی ایمانداریوں، ان کے اخلاق اور مہمان نوازی سے کوئی دلچسپی کوئی غرض نہیں ہے وہ ان کی کارکردگی یاد رکھتی ہے۔

حضرت عمر فاروق کی دوپہریں صحرا میں گزریں اور راتیں چوکیداریوں میں تو یہ سب تاریخ کے ایک صفحے پر جگہ بناتا ہے لیکن امیرالمومنین حضرت عمرؓ کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے تو جیسے کتابیں بھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کیا کھاتے کیا پیتے کس مقام میں کتنے کمروں کے گھر میں رہتے تھے کس طرح مہمانوں سے مصافحہ کرتے اور ان کی سواریوں کا نام کیا تھا تاریخ خاموش ہے لیکن سیف اللہ کی عسکری حکمت عملی آج دنیا کی فوجی اکیڈمیز کے نصاب میں شامل ہے۔ کتنوں کو یاد ہے کہ کارل مارکس نے اپنے بیٹے کو اخبار میں لپیٹ کر قبر میں اُتارا لیکن کمیونزم کے خالق کو پوری دنیا جانتی ہے۔ موزے تنگ سائیکل پر دفتر جاتا تھا اس کے پاس کپڑوں کے دو جوڑے اور جوتوں کی ایک جوڑی تھی ہمیں اس سے کیا دلچسپی لیکن عوامی جمہوریہ چین کے بانی کو کون نہیں جانتا۔ پاکستان کے خالق محمد علی جناح کو قوم اس لئے سلام نہیں کرتی کہ وہ بطور گورنر جنرل صرف ایک روپیہ تنخواہ لیا کرتے تھے یا ایک وقت کھانا کھاتے اور اپنے سٹاف کو ذاتی جیب سے تنخواہ دیتے۔ تاریخ ہمیشہ حکمرانوں کی ذاتی ایمانداری اور شخصی شرافت کو اہمیت دیتی ہے۔

اس ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ اس ملک کے ایک وزیراعظم کی شیروانی کے نیچے کرتا نہیں ہوتا تھا اور وزیراعظم کی اہلیہ کے ہاتھ برتن مانجھتے مانجھتے پھٹ گئے تھے۔ ہمارا ایک صدر ایسا بھی تھا جس کی آخری زندگی لندن کے ایک کرائے کے فلیٹ میں گزری تھی۔ ایک مطلق العنان حکمران ایسا بھی گزرا جو پی آئی اے کے عام طیارے میں عام مسافروں کے ساتھ نیویارک جاتا اور ایک ایسا نگران وزیراعظم بھی تھا جو اقتدار میں آنے کے بعد بھی لاہور

میں اپنے اس پرانے گھر میں مقیم رہا جہاں پر کال بل نہیں۔ لوگ کنڈی بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دیا کرتے اور جہاں کوئی نوکر، باورچی نہیں تھا اور خاتونِ اوّل رکشے پر بیٹھ کر سکول پڑھانے جایا کرتی تھیں۔ لیکن تاریخ سنگدل ہوا کرتی ہے ان سب کا ذکر اس لئے نہیں کرتی کہ ان کے کھاتے میں ان کی ذاتی ایمانداریوں کے سوا کوئی کارنامہ نہیں انہوں نے کوئی نیا نظام نہیں دیا، کوئی قوم تعمیر نہیں کی، کسی قسم کی اصلاح نہیں کی۔ عوام کو کوئی نیا نصاب نہیں دلایا نہ تعلیم نہ صحت نہ عزت اس لئے تاریخ نے انہیں بھلا دیا اور انسانی حافظے نے انہیں فراموش کر دیا۔

وزیراعظم صاحب! آپ کو قومی اسمبلی کے 342 اراکین کے ایوان سے 190 اعتماد کے ووٹ ملے ہیں۔ یہ وہ ایوان ہے جہاں ایک ارب پتی، 156 کروڑ پتی اور 183 لکھ پتی موجود ہیں جن کی ماہانہ تنخواہ 38 ہزار روپے فی کس اور جنہیں سالانہ ایک لاکھ روپے کے ٹریول ووچر بھی ملتے ہیں اور یہ ایوان اس عوام پر حکمرانی کرتا ہے جہاں 25 لاکھ نوجوان بیروزگار ہیں اور جہاں ایک کروڑ لوگوں کی ماہانہ آمدنی صرف 670 روپے ہے آپ کے ہر شہر میں ہر ہر قصبے میں بیسیوں کچی آبادیاں ہیں جہاں انسان کوڑے کے ڈھیروں اور کچرا گھروں سے روٹی کے ٹکڑے چن چن کر کھاتے ہیں جہاں امن وامان کی حالت یہ ہے کہ لوگ دروازوں کو تالا لگا کر رات بھر جاگتے ہیں جہاں کے سرکاری دفاتر میں دو روپے کے بال پین خریدنے کیلئے 15 روپے کی سٹیشنری خرچ کی جاتی ہے اور جہاں رشوت دے کے زکوۃ مانگی جاتی ہے جہاں آج بھی ایک کروڑ لوگ برسوں سے ایک عدالت سے دوسری اور دوسری سے تیسری سرکار کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ جہاں کے 70 فیصد عوام صدیوں سے کیچڑ چھان کر پانی سمجھ کر پیتے ہیں۔

وزیراعظم صاحب آپ کے پاس اقتدار کے 888 گھنٹے باقی ہیں اگر آپ اپنی

27 رکنی کابینہ اور چار عدد مشیرانِ کرام کو یہ ہدایت نامہ جاری کر دیں کہ وہ صرف ایک دن کیلئے اسلام آباد میں اپنے منسٹر انکلیو میں اپنے بنگلوں کے ایئر کنڈیشنڈ کا سوئچ آف کر کے اپنی بڑی بڑی سرکاری گاڑیاں گیرج میں کھڑی کر دیں، منرل واٹر کی بوتل کو ہاتھ نہ لگائیں، جاپانی مشینوں پر باریک سوتی دھاگے سے بنی کاٹن اور فرانس کی خوشبو لگائے اور پیروں میں اٹلی کے بنے جوتے پہنے بغیر سیکورٹی کے دستے اور پروٹوکول کی گاڑیاں چھوڑ کر چکوال، ٹنڈو آدم، لاڑکانہ، مردان، میانوالی اور گوادر تک جائیں اور کھال میں اترتی گرمی، وجود سے اڑتی حبس اور جسم سے جدا ہوتی زندگی کے درمیان کھڑے ہو کے یہ سوال کریں ان لوگوں سے کہ جمالی صاحب چلے گئے شجاعت صاحب آ گئے اور پھر شوکت عزیز آیا چاہتے ہیں اور پھر لوگ جو جواب دیں وہ بالکل درست اسی طرح واپس آ کر آپ کو بیان کر دیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ لوگ آپ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بیماروں کو گولی، ضرورت مند کو رقم اور مظلوم کو زبان دے دیجئے۔ سیکٹریز، ججوں، ایس پیز کو بسوں اور ویگنوں میں لا کر بٹھا دیجئے اور دفتروں سے جنگلے، گیٹ، استقبالیئے، بیرے اور اردلی ختم کر دیجئے اپنے دائیں بائیں بیٹھے لوگوں کی گردنوں سے سریئے آوازوں سے کڑواہٹ اور آنکھوں سے قہر نکلوا دیجئے۔ ہوائی اڈوں سے وی آئی پی لاؤنج ختم کر دیں۔ ہوٹروں کا گلہ دبا دیں پتھریلی زمین پر ہل چلانے والے دہقانوں کو سال بھر کیلئے آٹا دے دیں۔ دوزخ دوپہروں اور برف صبحوں میں روزی کیلئے گھروں سے نکلنے والوں کے دامن میں چند مٹھی گندم ڈال دیں۔ کچھ روتے بچوں کے آنسو پونچھ دیں۔ بے آسروں کو آسرا دے جائیں کچھ مغرور زبانیں کھینچ دیں۔ کچھ تنی گردنیں کاٹ ڈالیں۔ چند ٹھیکیداروں اور کمیشن خوروں کو چوراہوں پر جوتے لگوائے جائیں۔ کچھ اصلاح کوئی تبدیلی کوئی تازہ ہوا کا جھونکا لیکن اگر آپ نے بھی صرف اپنی مہمان نوازی، انکساری کے مظاہرے اور اپنے دامن کو چھینٹوں سے بچانے میں اگلے 888 گھنٹے گزار

دیئے تو پھر آپ بھی وزیراعظم کی ایوانوں میں لگی تصاویر میں سے ایک ہوں گے جسے ایک اتفاق بہا کر وزیراعظم ہاؤس تک لایا اور دوسرا بہا کے لے گیا کیونکہ تاریخ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے سیاست دانِ کا تذکرہ کرتی پھرے جسے قدرت نے لوگوں کی تقدیر بدلنے کیلئے اور انقلابی اقدام اٹھانے کیلئے اقتدار کے 1128 گھنٹے فراہم کئے اور اس نے یہ مدت استقبالیوں، عشائیوں، ملاقاتوں، بیانات اور آنے والے وزیراعظم کی انتخابی مہم میں ضائع کردی۔ جزیرے پر آخری لمحات میں پتھر توڑتا مجسمہ ساز جانتا تھا کہ کہ جزیرے توڈوبتے تیرتے رہتے ہیں۔ پارلیمنٹ اور اقتدار بھی آنی جانی چیز ہے۔ لیکن چٹانوں پر کندہ نقش باقی رہ جاتے ہیں اور جو شخص لوگوں کیلئے کچھ کر جائے اس کا نام چٹان پہ لکھی ایسی تحریر بن جاتا ہے جسے نہ تو ہوا مٹا سکتی ہے اور نہ کوئی طوفان۔

10 جولائی 2004ء

سرکاری وفود کے دورے اور قومی خزانہ

آج اپنی گفتگو کا آغاز اردو ادب کے ایک معتبر نام اسد محمد خان کی کہانی باسودے کی مریم سے کرتا ہوں جس کا مرکزی کردار مریم کسی گھر میں نوکرانی کا کام کیا کرتی تھی سیدھی سادھی سی ایک ان پڑھ عورت جسے کلمہ درست پڑھنا نہیں آتا تھا لیکن وہ دن رات اپنی زندگی کی ایک ہی خواہش ایک ہی تمنا پوری کرنے کیلئے پیسے جوڑتی رہتی تھی۔ کسی نے اٹھنی دی کسی نے روپیہ دیا وہ بھاگ کر اسے صندوقچی میں ڈال آتی۔ کسی نے نئے کپڑے، چادر کوئی کمبل یا رضائی دی فوراً بازار جا کر اسے بیچا اور پیسے فوراً اپنی صندوقچی میں جا ڈالے۔ کوئی مریم سے پوچھتا کہ اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہے اس پیسے کو جمع کر کے کیا کرے گی کبھی خود پر بھی کچھ خرچ کر لیا کر تو مریم کی آنکھوں میں ایک چمک سے نمودار ہو جاتی جو سوال کرنے والے کو بتاتی کہ میں رقم جمع کر کے عمرے پر جاؤں گی کعبے کا طواف کرونگی اور کملی والے کی نگری کی گلیوں کی خاک سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں میں سجاؤنگی۔ اسد محمد خان کی کہانی کی یہ مریم زندگی بھر اٹھنی اٹھنی روپیہ روپیہ جوڑ کر جب ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور وہاں کے خرچے کی رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور خوشی خوشی اپنی روانگی کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے تو عین اس وقت اس کا بیٹا بیمار ہو جاتا ہے اور مریم کی زندگی بھر کی جمع پونجی اس کے علاج پر خرچ ہو جاتی ہے۔

بچہ اس کے بعد صحت یاب ہو جاتا ہے لیکن مریم بہت تھکی تھکی بہت اداس سی نظر آتی ہے اور چند ہی دنوں میں بستر مرگ سے جالگتی ہے۔ مرنے سے کچھ وقت پہلے مریم اپنی مالکن کے کان میں کچھ سرگوشی کرتی ہے اور پھر دم توڑ جاتی ہے لوگ مالکن سے سرگوشی کی بابت پوچھتے ہیں لیکن وہ خاموش رہتی ہے لیکن مریم کی موت کے کئی سال بعد مالکن اپنے شوہر کے ساتھ حجاز مقدس جاتی ہے تو اسے مریم کی سرگوشی کے بارے میں بتاتی ہے۔ اکھڑتی سانسوں کے درمیان مریم نے کہا تھا کہ بیٹی جب کبھی سرکار دو عالمؐ کے روضے پر جاؤ تو کہنا کہ باسودے کی مریم تو آنا چاہتی تھی لیکن اس کا بیٹا بہت برا نکلا عین وقت پر بیمار ہو گیا اور ساری جمع پونجی اسی پر خرچ ہو گئی۔ ہوسکتا ہے حقیقی زندگی میں آپ کی ملاقات اس کہانی کی مریم جیسے لاتعداد لوگوں سے ہوتی ہو جو تمام زندگی میں نئے کپڑے نہیں سلواتے نئے جوتے نہیں پہنتے ایک وقت کھانا کھاتے ہیں اپنی ہر خواہش کچل کے اتنا پیسہ جمع کرتے ہیں کہ کہیں کا ب جبرائیل پر بھکاری بننے کے قابل ہو سکیں لیکن ان میں سے بھی کچھ ہی لوگ دیار حبیبؐ تک پہنچ پاتے ہیں اور میں نے ایسے لاتعداد لوگ دیکھے ہیں جن کی پلکیں حمد باری تعالیٰ سن کے آبشار بن جاتی ہیں اور ذکر رسولؐ پر جن کے سینے ہچکیوں سے یوں گونجتے ہیں جیسے گھڑے خالی ہوتے وقت چیخا کرتے ہیں۔ جس کی آرزو، خواہشات، تمنائیں پوری ہو گئیں اس نے در رسولؐ پر پلکوں سے دستک دے دی اور جو نہ پہنچ سکا وہ باقی زندگی لہو ٹپکاتا اور آہیں بھرتا رہ گیا۔

پچھلے سال جب ہماری قومی ایئر لائن نے عمرے کے کرائے میں اچانک دس ہزار روپے کا اضافہ کر کے اسے 34 ہزار کر دیا تھا تو نہ جانے اس کے بعد کتنی مریم اور کتنے بزرگ جو کئی سالوں سے پچیس تیس ہزار روپے جمع کر کے ٹریول ایجنٹ کے پاس پہنچے ہونگے ان کے دلوں پر کیا گزری ہوگی یہ صرف دل اور عقیدے والے ہی سمجھ سکتے ہیں اس سال بھی یہ اعلان کر دیا گیا کہ پی آئی اے کے کرائے میں جو پچھلے سال کراچی اور کوئٹہ سے سفر کرنے

والوں کیلئے 94ہزار612روپے اور اسلام آباد، لاہور اور پشاور والوں کیلئے 98ہزار 902 روپے اس میں اضافہ کیا جارہا ہے تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر ہماری قومی ایئر لائن جو پاکستان کا امیر ترین ادارہ ہے جو صرف پہلے چھ ماہ میں ڈیڑھ ارب روپے کے منافع کا اعلان کرتی ہے جو ہمیں 327 مسافروں کی گنجائش والے نئے خریدے گئے تین بوئنگ 777 طیارے اسلام آباد لینڈنگ کے مناظر سرکاری ٹی وی پر دکھاتے ہوئے یہ خوشخبریاں بھی سناتی ہیں کہ 2008ء تک ایسے تین نئے طیارے ان کی دسترس میں ہونگے آخر اس منافع بخش ادارے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ان لوگوں پر عمرے کے دروازے بند کر کے جو پاکستان سے اچار کی بوتلیں ساتھ لے جاکے وہاں ایک ریال کی روٹیاں خرید کر کھاتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں اور اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اپنے سوال کا جواب مجھے نہ مل سکا لیکن یہ ضرور پتا چلا کہ مستحق افراد کیلئے عمرے کے رعایتی ٹکٹ بھی جاری کئے جاتے ہیں اور یہ رعایتی ٹکٹ بلیک مارکیٹ میں عام زائرین کو فروخت کر کے کروڑوں روپے رشوت جیبوں میں جاتی ہے۔ پچھلے سال رعایتی ٹکٹ مختلف بینکوں، الیکٹرک کمپنیوں اور ٹریول ایجنٹس کے علاوہ مختلف ممتاز مذہبی شخصیات مثلاً پیر آف گولڑہ کو 37 فیصد رعایت کے ساڑھے ساتھ سو ٹکٹس اسی طرح ایک اور پیر صاحب 44 فیصد رعایت پر نو سو ٹکٹ دیئے گئے اور ایسی بہت سی دوسری مثالیں بھی ہیں عمرے کی ان بلیک کی گئی ٹکٹوں کیلئے عام اعلان کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات قومی ایئر لائن کے ذمہ داران اور رعایتی ٹکٹ حاصل کرنے والے ہی جانتے ہونگے لیکن اسد محمد خان کی کہانی باسودے کی مریم کا وہ کردار جو آج کروڑوں کی تعداد میں پاکستان کے ہر ہر شہر گاؤں اور دیہات میں بستا ہے وہ اگر تمام زندگی کی آرزوؤں کے باوجود غلاف کعبہ کو چومنے اور درِ مصطفیؐ پر سلام کی سعادت سے محروم رہتا ہے تو کیا وہ اس تمام اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے جس کیلئے وہ برسوں تڑپتا رہا۔ اسد محمد خان کی کہانی کے

ان کروڑوں جیتے جاگتے لوگوں کو یہ نوید ہو کہ انہیں کسی نہ کسی انداز میں اجر و ثواب یوں ملتا رہتا ہے کہ ان کے خرچے ان کے پیسوں ان کے ادا کیے گئے ٹیکسوں سے شاید ان سے کہیں زیادہ ضرورت مند وقتاً فوقتاً عمرے اور زیارت مدینہ کی سعادت حاصل کرتے رہتے ہیں مثلاً پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں 316 وی آئی پی شخصیات جن میں وفاقی وزراء، اراکین قومی اسمبلی اور سینٹ کے لوگ اور ان کے اہل خانہ شامل تھے وہ 54 ملین روپے خرچ کر کے حج کی سعادت حاصل کر چکے اور یہ 54 ملین روپے زکوٰۃ کی رقم سے خرچ ہوئے تھے۔ میاں نواز شریف کے دور میں بھی یہ سلسلہ چلتا رہا اور کل صبح عمرے کی سعادت سے واپس آنے والے وزیر اعظم کے وفد کے اراکین کی تعداد 145 ہے اس وفد کے علاوہ وزیر اعلیٰ سندھ کے ساتھ ایک چالیس رکنی وفد بھی جا کے عمرے کی سعادت حاصل کر چکا ہے۔ ایک سعودی صحافی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ پچھلے ہی ماہ تو دوسرا وزیر اعظم اپنے بڑے وفد کے ساتھ عمرہ کر کے گیا تھا تو اسے جواب ملا کہ فکر نہ کرو اگلے ماہ ایک اور وزیر اعظم یہ فریضہ ادا کرنے کو آنے والا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ قومی ایئر لائن کے شراب کے نشے میں دھت ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی مدینہ منورہ میں غل غپاڑے کی وجہ سے سعودی حکام نے اس وفد کے اراکین کیلئے کعبہ شریف کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار رہنے والے پونے دوسو افراد میں سے کچھ تعداد اگلے ماہ شوکت عزیز کے ساتھ جا کے یہ سعادت ضرور حاصل کر لے گی میں کوئی عالم دین نہیں اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ عوام کے خرچ پر عمرے کی سعادت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ ثواب اور برکتوں کا سبب بنتی ہے یا بوجھ میں پہلے سے زیادہ اضافہ کر دیا کرتی ہے میں نہیں جانتا یہ فیصلہ کریں گے ہمارے مذہبی سکالر اور آپ لوگ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆☆ ممتاز صحافی عرفان صدیقی سے بات چیت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طویل عرصے سے سرکاری وفود عمرے کی سعادت حاصل کرنے جاتے ہیں اس کا کیا پس منظر ہے اور یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟

☆☆ یہ سلسلہ کافی دیر سے چل رہا ہے لیکن جنرل ضیاء الحق کے دور میں ملک میں مذہبی رجحانات عام ہوئے اس دور میں عمرے اور حج پر جانے کا عوامی سطح پر نیا رجحان پیدا ہوا اور اس وقت سے ہمارے حاجیوں کی تعداد بڑھ گئی اور جو سرکاری افسران ہیں وہ بھی دوسرے دوروں کے ساتھ ساتھ حج اور عمرے کی سعادت بھی حاصل کرتے رہے اور اب یہ روایت بڑی پختہ ہوگئی ہے کہ جب دوسرے ممالک کا دورہ کرتے ہیں حکمران تو اس کا طریقہ کار الگ ہے لیکن جب عمرے یا حج کیلئے پاکستانی حکمران جائے گا تو صرف اس سعودی حکومت کو اطلاع کرنی ہوگی اور باقی سعودی حکومت تمام انتظامات کرتی ہے کیونکہ پاکستان کے اعلیٰ حکمران ان کے مہمان ہوتے ہیں اور اس دوران سعودی حکمرانوں سے ملاقاتیں بھی طے کرلی جاتی ہیں ہمارے حکمران جہاں ٹھہرتے ہیں ان میں مشہور ہوٹل شیرٹن، اوبرائے ہوٹل وغیرہ ہیں۔

27 جولائی 2004ء

انسانیت کی تذلیل اور۔۔۔۔

تاریخ ثابت کرتی ہے کہ جب طاقت کے بے محابا استعمال اور برہنہ بربریت ہی کو دستورِ زندگی بنالیا جائے اور انسانی حقوق کے گن گانے والی مہذب دنیا انہی کو اصول وضابطہ قرار دے ڈالے تو پھر درندگی کو لگام دینا ممکن نہیں رہتا۔ مہذب جمہوریت پسند دنیا کا انصاف، معرکے پر معرکے سر کرتا، انسانی بستیوں اور راہ گیروں کے قافلوں، مدرسوں، خوراک کے گوداموں، نمازیوں سے بھری مساجد، قلعہ جنگی کے تہہ خانوں، تورہ بورہ کے غاروں، بصرہ کی گلیوں، نجف شریف کے مزاروں سے ہوتا ہوا بغداد کے ابوغریب جیل سے اپنے جلوے دکھاتا اب ایک عالم کی نگاہیں خیرہ کر رہا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ خود سپردگی کی ذلت سے انکار کرنے والے کتنے قیدیوں نے وہاں جانیں دے ڈالی ہوں گی اور کتنے قیدی اس رقصِ ابلیسی کی نظر ہوئے جن کی تصاویر دیکھ کر جانے مجھے کیوں لگا کہ یہ برہنہ عراقی قیدی نہیں 56 اسلامی ممالک ہاتھوں کو اپنی پشت

سے باندھے چہروں پر نقاب ڈال کر شرم سے اپنا منہ چھپائے ذلت آمیز ٹھوکروں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ بغداد کے ایک عقوبت خانے سے منظر عام پر آنے والی یہ کہانی بھی جلد ہی قصہ ماضی بن جائے گی۔ انسانی حقوق کے علمبردار مغربی ذرائع ابلاغ کے محتسب تجزیہ نگار تھوڑا بہت شور مچانے کے بعد خاموش ہو جائیں گے کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ دنیا خونِ مسلم کے بارے میں زیادہ حساس نہیں ہے اور اگر آلہ قتل کسی امریکی فوجی کے ہاتھ میں ہو تو زبانیں ویسے بھی گنگ ہو جایا کرتی ہیں عقوبت خانوں سے رہائی پا کر ٹی وی چینلز سے گفتگو کرنے والوں کے نہ لہجوں کی طرف داری میں کوئی فرق آیا ہے نہ ہی ان کی گردنیں جھکی ہیں اور نہ ہی جذبوں کی آنچ مدھم نظر آئی ہے۔ عراقی مطمئن ہیں کہ اب ہمیں اپنے بچوں کو فرعونی طاقتوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کا درس دینے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ تازہ دم سپہ خود انہی عقوبت خانوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی آغوش تربیت میں پروان چڑھ رہی ہے۔

امریکی فوج نے اپنے سات اہلکاروں کے خلاف تحقیقات شروع کی ہیں تاہم کسی کو معطل سبکدوش برطرف یا گرفتار نہیں کیا گیا۔ صدر امریکہ نے سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کو ہدایت فرمائی ہے کہ قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک کے ان ذمہ داران کے خلاف سخت کارروائی کی جائے اور برطانیہ میں اس قسم کی یقین دہانی حکومت کی طرف سے پارلیمنٹ کو بھی کرائی گئی ہے۔ برطانیہ میں شائع ہونے والی تصاویر کے صحیح یا غلط ہونے پر ایک بحث چھڑ گئی ہے۔ ابوغریب کے عقوبت خانے میں پڑے ساڑھے چار ہزار قیدیوں کے علاوہ عراق کے طول وعرض میں پھیلے ایسے ہی مراکز میں موجود گیارہ ہزار مسلمانوں کی یہ تضحیک گویا عرب دنیا کے دلوں میں بھڑکتی بھٹی کا ایندھن بن چکی ہے طالبان کو کن جرائم کی سزا دی گئی تھی یہ کہ وہ انسانی حقوق کا احترام نہیں کرتے یہ کہ وہ پردے کی پابندیاں کراتے ہیں یا یہ کہ وہ تصویریں نہیں اترواتے ہیں یا یہ کہ وہ جمہوری طور پر منتخب نہیں ہوئے اور وہ اسامہ کے خلاف

ثبوت مانگتے ہیں۔صدام حسین کو معزول کیوں کیا گیا اس لئے کہ وہ اپنے مخالفین پر تشدد کرتا ہے اپنے خلاف اٹھنے والی آواز کچلتا ہے عراقیوں کو مارنے کیلیئے سب ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ظالم ہے جابر ڈکیٹیٹر ہے۔ایسے تباہ کن ہتھیار تیار کر رہا ہے جن سے وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ یورپ اور پوری دنیا کو جہنم بنانا چاہتا ہے اور اس کے ہاں القاعدہ کے تربیتی مراکز ہیں یا یہ کہ وہ 11 ستمبر کے حملوں کا مرکزی کردار ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ امریکی حکام کی جانب سے ان تصاویر کے منظر عام پر آنے کے بعد جس منطق اور استدلال کا سہارا لے کر مسلمان دنیا کے آتش زدہ ذہنوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس سے وہاں دلوں کی چنگاریاں مزید بجھ پائیں گی۔ میں افغانستان میں طالبان کے طرزِ حکومت سے کئی قسم کے شدید اختلافات رکھنے کے باوجود مغربی میڈیا میں عراقی قیدیوں کے ساتھ رونما ہونے والے سلوک پر حیران ہوتے تجزیہ نگاروں سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ سب بھی تو مغرب میں اپنا ایک مخصوص تہذیبی مزاج رکھتے ہیں۔آپ کسی دوسرے کو یہ حق دینے کو تیار نہیں کہ وہ آپ کے تہذیبی اور ثقافتی شناخت پر کسی بھی طرح سے حملہ کرے۔آپ کے چند ممالک میں تو سر پر سکارف پہننا بھی اس نظریئے کے تحت معتوب قرار پایا ہے کہ اس سے اپنی تہذیب کو خطرہ محسوس کرتے ہیں لیکن آپ یہ بتائیں کہ اگر آپ کے ہاں ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ دے دیا جاتا ہے۔کنواری ماؤں کے حقوق کے چارٹر منظور ہو جاتے ہیں۔ برہنہ انسانی آزادی کی قرار دادیں پاس ہو جاتی ہیں۔شادی کے بغیر گھر بسانے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔مرد مرد کے ساتھ اس کی بیوی کے طور پر رہ سکتا ہے۔تو پھر کسی مسلمان مرد کا عمامہ پہننا، داڑھی رکھنا ،کسی عورت کا حجاب میں رہنا کس طرح آپ کی طرف سے جاہلیت قرار پاجاتا ہے۔آپ کی طرح ہم بھی اپنی ثقافت تہذیب اور اپنی معاشرت رکھتے ہیں اور ہمیں ان پر عمل پیرا ہونے پر

فخر ہے۔ اگر میں لندن پیرس یا کسی امریکی ساحل پر اٹھکیلیاں کرتی برہنہ خواتین کو شرم و حیا دینے کا حق نہیں رکھتا تو آپ ہماری خواتین کو بے حجاب کرنے اور ان کے نقاب نوچنے کا اختیار کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کی طرف سے جاہل وحشی قرار دیئے گئے طالبان کی قید سے رہائی پانے والی برطانوی صحافی خاتون کس طرح ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہوگئی تھیں کیا آپ کو یاد ہے؟

مصری اخبار ''الدستور'' اپنے اداریئے میں لکھتا ہے کہ عراق میں امریکیوں نے اپنے سفید فام نسل پرست فرقے کوکس لینڈ کے چند افراد کو بھیج رکھا ہے۔ عرب ''الحرام'' کہتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے صرف مذہبی بیانات مسلمانوں کیلئے کافی نہیں ہیں اور ایک بین الاقوامی عدالت کو فوری طور پر تشکیل دے کر ذمہ داروں کو اس کے کٹہروں میں لے آنا چاہیے اور تشدد کے علاوہ قیدیوں کو برہنہ ذلت آمیزی کا نشانہ بنانا مسلمانوں کیلئے مزید دکھ کا سبب بنتا ہے اور یہ سب کچھ اس وقت سامنے آیا ہے جب مشرق وسطی میں امریکی پالیسی ہچکولے کھا رہی ہے۔ پرچموں میں لپٹے آبنوسی تابوتوں کی امریکہ آمد میں تیزی آچکی ہے اور اریل شیرون کے مقبوضہ فلسطینی علاقوں پر قبضے کی منظوری وائٹ ہاؤس پر شدید تنقید کا سبب بن رہی ہے۔ ان تصاویر نے مجھے قاسمی صاحب کا ایک شعر یاد دلایا ہے۔

دل گیا تھا تو پھر آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

مغربی میڈیا کی طرف سے ان تصاویر کا منظر عام پر آنا اور پھر مسلم دنیا کے میڈیا میں اس پر شدید غم و غصے کا اظہار ہے۔ ہمارے ساتھ سابق وزیر اطلاعات و نشریات اور میڈیا کی دنیا کا ایک بہت بڑا نام جاوید جبار موجود ہیں

☆☆ جاوید جبار صاحب ہمیں بتائیں کہ یہ جو تصاویر امریکی ٹی وی چینل پر

قوم کے سامنے لائی گئی ہیں اور اس کے بعد ایک برطانوی اخبار نے بھی کچھ تصاویر کو شائع کیا جو کہ عراقیوں پر ظلم کر رہے ہیں ان تصاویر کا مغربی دنیا پر کیا ردعمل ہوا ہے؟

☆☆ ان خبروں اور تصاویر کے شائع ہونے کے بعد کہا گیا کہ اس بارے میں ایک تحقیقی کمیٹی بنائی گئی ہے اور اس ظلم کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے ایک عجیب سا پہلو سامنے آتا ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں ایک ایسے ادارے میں جہاں جمہوری ہونے پر اتنی شان وشوکت کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ شفاف نظام دنیا میں نہیں ملتا۔ وہاں پر جب تک ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ حقیقت سامنے نہیں آتی تو اعلیٰ سربراہان کو ان کا علم ہی نہیں کہ ان کے اپنے اداروں میں کیا ہو رہا ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ بہ نسبت پاکستان کے جہاں پر جونیئر سرکاری افسران کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ براہ راست ذرائع سے گفتگو کریں آپ نے دیکھا کہ برطانیہ کی افواج مسلسل ذرائع ابلاغ سے رابطے میں رہتی ہیں۔ یہ ان کی حالت ہے کہ ان کو میڈیا کے ذریعے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے مگر ذرائع ابلاغ سے مسلسل رابطے سے نہیں چلتا میں سمجھتا ہوں انہیں سب معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

لیکن میں داد دیتا ہوں کہ میڈیا کو اتنی جرات ضرور ہوئی کہ ان خبروں کو عوام تک لے کر آئے۔ ان کا میڈیا افغانستان، عراق جنگ میں بھی موجود تھا۔ ان کا میڈیا تنقید بھی کرتا ہے اور جو بات صحیح ہو اسے بھی نشر کرتا ہے۔

5 مئی 2004ء

کراچی کے بگڑتے حالات اور ایجنسیوں کا کردار

میں اس امریکی نقطہ نظر سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد ایک نئی دنیا نے جنم لیا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں افغان عوام کی ہڈیاں بنیادوں کا اینٹ روڑا بنیں۔ اسلامی ممالک اپنی اپنی پوٹلیاں سنبھالے بیٹھے رہے اور دنیا عراق میں ٹوٹتی اقدار، رسوا ہوتی روائتوں، سرِ عام لٹتے انسانی حقوق اور تذلیل کے بحرِ ظلمات میں ڈبکیاں کھاتی انسانیت کا تماشہ دیکھتی رہی۔ تب ہمارے سامنے بے شمار مراعات لامحدود عنایات اور بے حد شیریں ثمرات کی ایسی برسات کا تصور پیش کیا گیا تھا کہ ہماری آنکھوں میں جنت ارضی کے خواب نظر آنے لگے تھے۔ اس تمام عرصے ہم انہیں الجھنوں کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کس کس کے اعتماد پر پورا اترنے کیلئے ہم کیا کچھ کریں اور ایثار و قربانی کے کون کون سے اقدامات کے ذریعے کن کن نازک مزاجوں کے دلوں کا میل صاف کریں۔

اس دوران ہم آپ کو خبریں دیتے رہے، مسجدوں کے میناروں کے زمین بوس ہونے کی خبریں، بستیوں کے پیوند خواب بننے کی خبریں، پاکستانیوں کی دنیا بھر میں تذلیل کی خبریں، کیوبا کے اسیروں کی حالت زار کی خبریں، عراق سے بے گناہوں کے جرمِ ضعیفی کی خبریں۔ یہ خبریں ہم سناتے رہے اور آپ کے ساتھ دہکتے انگاروں پہ لوٹتے رہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں ہمارے لوگ بہت روئے اور بلبلائے۔ سردیوں کی لمبی راتوں میں دعاؤں کے دیے فروزاں کر کے بیٹھے رہے اور ان کی آہیں سسکیاں اور آنسوان کی اپنی دیوارِ جان تک ہلاتے رہے لیکن آج میرا ملک خود عجب حالات کا شکار ہو چکا ہے۔ ہم خود ہی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کے اپنی پشت پر تازیانے برسانے پر مجبور ہیں۔ میرے کراچی کے گلی کوچے پھر خون سے سرخ اور فضائیں بے گناہوں کی چیخوں اور آہوں سے لرز رہے ہیں۔ کچھ دیر پہلے معروف ترین شاہراہ پر اللہ کے حضور سجدے میں گرے مسلمان پھر اپنے لہو سے وضو کر گئے ہیں اور یہ سانحہ پرسوں مفتی شامزئی جیسے جید عالم کی شہادت کے اگلے ہی روز پیش آیا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی تحقیقاتی کمیشن تشکیل دے کر مختلف حکومتی اور اپوزیشن لیڈرز اپنے مزاحمتی بیانات داغ کر اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں جو کہ روایتی طور پر ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان کے بیانات کی اب کوئی اہمیت نہیں۔ یہ واقعات شیعہ سنی تصادم کرانے کی ایک بڑی کوشش ہے جسے عوام بار بار اپنی جانیں دے کرنا کام بنا رہے ہیں۔ مساجد اور امام بارگاہوں سے برآمد ہوتے جنازے اور انہیں کندھا دیتے غم سے نڈھال چیخ رہے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے اور تمہاری ہر سازش تمہارے ہی تابوتوں میں تمہارے ساتھ دفنا دیں گے۔ کچھ دیر پہلے امام بارگاہ تب نشانہ بنی جب مفتی نظام الدین شامزئی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ مفتی صاحب اس وقت بھی علمِ جہاد بلند کیے رہے جب بڑے بڑے مذہبی رہنما بھی لفظ جہاد سے تائب ہو کر مصلحتوں

اور سمجھوتوں اور حقیر مفادات کے انبار تلے کچلے گئے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے مفتی شامزئی کو شہید کیے جانے اور امام بارگاہوں پر حملے کے محرکات پر خاموش ہیں۔ وہ بولیں بھی تو کیا بولیں کہ انہیں اداروں میں شامل افراد تو حیدری مسجد کے بم دھماکوں سے لے کر صدر مملکت پر ہونے والے قاتلانہ حملے تک میں خود ملوث قرار دیئے جا چکے ہیں۔

مفتی نظام الدین شامزئی کا تعلق سوات کے نواحی علاقے شامزئی سے تھا جہاں ان کی ضعیف والدہ ابھی بھی رہتی ہیں تاہم وہ پچھلے چالیس سال سے کراچی میں مقیم تھے جہاں ایک طویل عرصے تک جامعہ فاروقیہ سے منسلک رہنے کے بعد 1988ء میں جامعہ بنوریہ ٹاؤن سے وابستہ ہو گئے اور وہ اس وقت دار الفتاوہ کے سربراہ تھے جو فتویٰ جاری کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ انہوں نے نوے کی دہائی میں سندھ یونیورسٹی سے امام بخاری کے اساتذہ پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں جو تمام حفاظ قرآن ہیں۔ مفتی نظام الدین شامزئی افغانستان طالبان دور کے دوران پاکستان میں ان کے اہم ترین سرپرست جانے جاتے رہے ہیں اور کچھ ذرائع یہاں تک کہتے ہیں کہ ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن کی پہلی ملاقات بھی نوے کی دہائی میں بنوریہ ٹاؤن کی مسجد میں مفتی شامزئی کے توسط سے ہوئی اور غالباً ان کا یہی اثر ورسوخ تھا جس کے باعث وہ اٹھائیس ستمبر 2001ء کو قندھار جانے والے اس وفد میں شامل تھے جو وہاں آئی ایس آئی کے تب کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد کے ساتھ اس مشن پر گیا تھا کہ طالبان کو اسامہ بن لادن سے دستبردار ہونے پر رضامند کیا جا سکے۔ اس وفد میں مفتی تقی عثمانی، مفتی محمد جمیل، مولانا آصف جان، اور قاری مفتی شیر علی شاہ جیسے علماء بھی ان کے ساتھ تھے۔ مغربی میڈیا نے اس وقت کی قندھار موجودگی کے دوران یہ رپورٹ دی کہ علماء نے ملا عمر کو کسی نقطہ پر قائل کرنے کی بجائے انہیں اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا

تھا اوران کے ساتھ افغانستان پر امریکی حملے کی صورت میں وہاں مزاحمتی تحریک کی حکمت عملی پر تبادلہ خیال کیا۔ مفتی شامزئی ایک طویل عرصے تک حرکت المجاہدین کے بھی سربراہ رہے اور جب مولانا محمود اظہر نے اپنی تنظیم تشکیل دی تو وہ اس تنظیم کے بھی سرپرست مقرر ہوئے اور اس پر امریکی پابندیوں کے بعد نام تبدیل کر کے تحریک فرقان کہلائے جانے کے بعد وہ اسی ذمہ داری پر رہے۔ یکم جولائی 1999ء کو معرکہ کارگل کے دوران مفتی نظام الدین شامزئی نے اسلام آباد میں حرکت المجاہدین کی درخواست پر بھارت کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا جس میں ملک کے تمام مدارس میں زیر تعلیم طلباء سے مقبوضہ کشمیر جا کر بھارتی تسلط کے خلاف نبرد آزما ہونے کا کہا گیا۔ کارگل کے بعد مفتی صاحب نے میاں نواز شریف کو امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال کر مجاہدین، شہداء اور افواج پاکستان سے غداری کا مرتکب قرار دیا۔ افغانستان پر امریکی جارحیت کے خلاف بھی اکتوبر 2001ء میں مفتی شامزئی کا جہاد کا فتویٰ سامنے آیا تھا۔

ایک طویل عرصے سے مفتی شامزئی ایک معتدل مزاج کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مفتی شامزئی کے قاتلوں تک پہنچنا شاید بہت سہل نہ ہو کیونکہ ان کے لاکھوں عقیدت مندوں کے ساتھ ساتھ ان سے شدید اختلاف رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایسے بھی ہونگے جو مفتی صاحب کی شہادت کو اسی ماہ کے اوائل میں حیدری مسجد میں اٹھارہ بے گناہ شیعہ حضرات کے خون کے بدلے سے تعبیر کر کے اور جو امام بارگاہ میں ہوا اس سانحہ کو شیعہ سنی رنگ دینے پر سوچ رہے ہونگے اور ایسے بھی ہونگے جو اس واقعے کے پیچھے حساس اداروں یا حکومت سندھ کو ملوث کرنے کے خواہاں ہونگے۔ ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو سانحہ کو ان عناصر کی سازش سے تعبیر کرتے ہونگے جو ایک بار پھر کراچی کا امن سکون غارت کر کے اسے ایندھن بنانے پر تلی ہیں یا پھر وہ جو مختلف علمائے دین کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ان

کے عقیدت مندوں کو جذبات کی رَو میں بہا کر قتل و غارت کا نیا کھیل شروع کرنا چاہتے ہیں۔

سلام ہے کراچی کے ان عوام پر جو کندھوں پر لاشیں تو اٹھا رہے ہیں لیکن اس سازش کا شکار نہ بن کر شیعہ سنی فساد کو مسترد کر رہے ہیں۔ جو بھی ظلمت میں مارا جا رہا ہے جو بھی دہشت گردی کا نشانہ بن رہا ہے وہ شہید ہے اور ہم اس کے درجات کی بلندی کیلئے اللہ سے دعا گو ہیں۔

آج ہمارے ساتھ شریک گفتگو ہیں لیفٹینینٹ جنرل (ر) جاوید اشرف قاضی جو آئی ایس آئی کے سابق سربراہ بھی رہے ہیں۔

☆☆ پہلے حیدری مسجد میں بم دھماکہ پھر شامزئی کی شہادت اور اب پھر امام بارگاہ میں بے گناہ لوگوں کو خون میں نہلا دیا گیا۔ جنرل صاحب یہ ہمارے کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟

☆☆ ڈاکٹر صاحب یہ وہی مذہبی انتہا پسندی کی لہر ہے جو کہ کافی عرصہ سے ہمارے ملک میں دوڑ رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک حکومت بیان بازی سے بڑھ کر کوئی عملی اقدامات نہیں کرے گی تو یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ کراچی میں اس لئے زیادہ دہشتگردی ہوتی ہے کہ یہاں پر ہر طور کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ جن کی نہ تو ہم رجسٹریشن کر سکتے ہیں اور نہ ہمیں پتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہوئے ہیں۔ افغانی بہت زیادہ ہیں اور اسی طرح مدرسے بھی بے تحاشا ہیں اور ہر مدرسہ اچھا نہیں ہوتا۔ بہت سے مدرسے ایسے ہیں جہاں پر یہ پڑھایا جاتا ہے کہ شیعہ کو مارو تو جنت میں جاؤ گے اور دوسری طرف سنی کو مارو گے تو جنت میں جاؤ گے۔ ایسے مدرسوں کو جب تک ہم بند نہیں کریں گے رجسٹرڈ نہیں کریں گے ان کی دیکھ بھال نہیں کریں گے تو یہ ایسی ہی ذہنیت کے لوگ پیدا

کرتے رہیں گے۔ اگر وہ ایسا کہتے ہیں کہ ہم اس میں ملوث نہیں تو وہ صحیح کہتے ہیں۔ وہ کیوں اپنے آپ کو واضح کریں۔ اب تک جتنے بھی واقعات ہوئے ہیں دہشت گردی کے ان میں پاکستانی ہی پکڑے گئے ہیں اور ہم اپنے سر سے ذمہ داری اتارنے کیلئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ غیر ملکی تھے۔ غیر ملکی بھی ہونگے وہ لوگ بھی ان کی مدد کرتے ہونگے۔ لیکن کارروائیاں کرنے والے ہمارے اپنے لوگ ہوتے ہیں۔ جنرل مشرف کے اوپر حملہ کن لوگوں نے کیا ہمارے اپنے پاکستانی تھے۔ ان مدرسوں ہی سے ایسے لوگ تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ پہلے آرمی والوں پر پابندی تھی کہ کسی مدرسے یا جماعت سے منسلک نہیں ہو سکتے لیکن افغان جہاد کے بعد انہوں نے مدرسوں کا رخ کر لیا اور ان کی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا اور ان لوگوں کا ذہن جو وہاں جا کر بیٹھتے ہیں ویسے ہی ہو گیا ہے۔ ہمیں اپنے تمام مدرسوں پر نظر رکھنی چاہئے تا کہ ہمارے عوام بھی چین و سکون کی زندگی بسر کر سکیں اور ایسی گھناؤنی کارروائیوں سے بچے رہیں۔

یکم جون 2004ء

اسلامی طرز زندگی

جب 1326ء میں حضرت عثمانؓ کا انتقال ہوا تو ان کی باقاعدہ سلطنت کا دائرہ کار بحیرہ اسود تک پھیل چکا تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی وفات کے وقت ان کے گھر سے ایک سوئی، پگڑی اور لکڑی کے چند برتنوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد سلطان سلیمان اعظم تک 10 عثمانی حکمران گزرے جن میں رومی سلطنت کا پایہ تخت قسطنطنیہ فتح کرنے والا سلطان محمد فاتح بھی ہے۔ بنوامیہ کے دور سے ہی اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ لیکن مثلث کی شکل میں دو اطراف سے گھرا یہ شہر اس قدر محفوظ تھا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی لشکر اس شہر کو فتح نہ کر سکا۔ ثقہ روایت یہ ہے کہ یہ شہر بزرگ حضرت شمس الدین کی دعا سے فتح ہوا جو تب تک سجدے میں گرے رہے جب تک شہر کی فیصل میں شگاف نہ پڑ گیا۔ سلطان محمد فاتح کو وہ حدیث مبارکہ بھی یاد تھی جس میں رسول اللہ نے قسطنطنیہ فتح کرنے والے لشکر کی تعریف کی تھی۔ اس شہر کی فتح کے بعد پوری عیسائی دنیا میں سوگ منایا گیا۔ پھر آنے والے حکمران یعنی سلطان سلیم اول نے 1515ء میں سلطان کے ساتھ خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا۔ کیونکہ اس نے مصر میں اُن مملکتوں کو شکست دے کر جہاں بے اختیار عباسی خلیفہ بنے ہوئے تھے اسلامی اختیار کا مرکز قسطنطنیہ کو بنا لیا۔ اور پوری دنیائے اسلام اور حجاز میں اس کے بعد ترک سلطان کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ یہ کتنی وسیع سلطنت تھی اس کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں فلسطین، عراق، قبرص، یونان، آذربائیجان، رومانیہ، جزیرہنما عرب، شام، تیونس، لیبیا، مصر، ہنگری، بلغاریہ، مراکش کے

علاوہ کئی دیگر علاقے شامل تھے اور حیران کن بات یہ ہے کہ یہ سلطنت طویل عرصے تک قائم رہی۔ اس کے مقابلے پر آپ جانتے ہیں کہ سوویت یونین کا وجود صرف 80'70 سال تک اور برطانیہ بھی اپنی عظیم الشان سلطنت صرف 90'80 سال تک قائم رکھ سکا۔ لیکن دنیا کے 3 براعظموں میں پھیلی عثمانی سلطنت صدیوں تک اپنی جگہ پر موجود رہی۔ لیکن جب اس کا زوال شروع ہوا تو ایک ایک کر کے علاقے عثمانی حکمرانوں کے ہاتھ سے نکلتے رہے اور ایک وقت وہ آ گیا کہ جب چھوٹی چھوٹی یورپی ریاستوں نے بھی خودمختاری حاصل کر لی اور یہ عثمانی سلطنت یورپ کا مردِ بیمار کہلائی۔ جو چاہتا اس کا کوئی حصہ ہتھیا لیتا اور ایک خاص بات کہ جس کی نشاندہی میں یہاں زور دے کر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بات بھی سکھاتا ہے کہ سلطنتوں کے زوال کی اہم نشانی بالکل اسی طرح ہے، جس طرح خزاں کے موسموں میں دن مختصر ہوتے ہیں یہاں زوال کے دوران حکمرانوں کا عرصہء حکومت مختصر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اصول تاریخ کی ہر بڑی سلطنت پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ مغلیہ سلطنت میں بھی آپ جانتے ہیں کہ بابر سے لے کر اورنگزیب عالمگیر تک حکمرانوں کے دور معقول حد تک طویل ہوا کرتے تھے۔ لیکن انکے نالائق جانشین چند دنوں کے لئے آتے اور رخصت ہو جاتے۔

جیسا کہ اکثر تاریخ دان یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر بڑی جنگ کسی بڑی سلطنت یا طاقت کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب سلطنت عثمانیہ ختم ہوئی تو وہ پچاس کروڑ ڈالر کے غیر ملکی قرضوں میں دبی ہوئی تھی۔ آخری ایام میں 75 ہزار ترک جوان سلطنت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ابھرنے والی بغاوتوں کو کچلنے کی ناکام کوششوں میں اپنی جانیں قربان کر چکے تھے پھر بھی شکست پر شکست ہوتی رہی اور تباہی کی انتہا تب ہوئی جب 1908ء میں اصلاح پسندوں اور عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید دوئم کے درمیان تنازع اس

بات پر کھڑا ہو گیا کہ بادشاہ اپنے اختیارات پارلیمنٹ کو دینے پر تیار نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو معزول ہونا پڑا اور علامتی بادشاہت قائم ہوئی لیکن یہ علامتی بادشاہت بھی چند روز کی مہمان ثابت ہوئی اور ترکی کو سلطنت کی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنی بقاء کی جنگ لڑنی پڑی۔ ترکی جرمنی کا حلیف تھا اور درہ دانیال جو ترکی کی شہ رگ کہلاتا تھا کے دفاع میں 4 لاکھ لوگ مارے گئے۔ اتحادیوں نے یونان کو ترکی پر چڑھا دیا جو خود کبھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہوا کرتا تھا۔ اور 1923ء میں سلطنت عثمانیہ کی اجتماعی حیثیت کا بھی سرکاری طور پر خاتمہ ہوا۔ اس موقع پر برصغیر میں علی برادران اور دیگر مسلمان رہنماؤں نے خلافت کی بحالی کے لئے تحریک چلائی۔

خلافت عثمانیہ پر اس وقت جو قیامت گزر رہی تھی۔ اپنوں کی غداری اور لارنس آف عربیہ جیسے مکاروں کے باعث زمین عثمانیوں کے لئے تنگ ہو گئی۔ اقبال کا خیال تھا کہ جب شام، حجاز، فلسطین، عراق، لیبیا، تیونس اور مصر وغیرہ کے مسلمان ہم مذہب لوگوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں اور ان کا خون بہا رہے ہیں تو روس، اٹلی اور برطانیہ سے کیا گلہ۔ اس خلافت کو بچانے میں عثمانیوں کی رگوں کا سارا لہو نچوڑ لیا گیا۔ بلقان کی جنگوں میں ان کے لاکھوں جوان قتل ہو گئے اور وہ سلطنت جو کبھی چالیس لاکھ مربع میل سے زیادہ بڑی تھی اب ایک چھوٹی سی قومی ریاست بن گئی۔ جہاں صرف ترکی بولنے والے موجود تھے یعنی خلافت کا بھاری پتھر ایک طرف پھینک دیا گیا اور جب ترکوں پر برا وقت آیا اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوئے تو خلافت، خلافت پکارنے والی کسی غیر ترک مسلمان قوم نے ان کا ساتھ نہ دیا خصوصاً عربوں نے عین نازک موقع پر فرنگیوں کے دامِ فریب میں آ کر ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا اور ایک عظیم مسلم سلطنت کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ اس المیہ کی ذمہ داری آپ کتنی ہی انگریزوں اور یہودیوں پر ڈالیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار صرف اور صرف مسلمان ہیں اور عثمانی حکمرانوں کی خدا فراموش ان حرکتوں نے عظیم قوم کو

اوج ثریا سے پستیوں میں جا گرایا۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا میں آج تک کسی حکومت کے بادشاہ نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا اور شاید یہ سبق انہیں سیکھنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ دنیا میں جو نظام کام کرتا ہے۔ اس کے تحت ہر غالب پر کسی اور غالب کا مسلط ہونا ضروری ہے۔ اس تباہی اور بربادی کے اسباب جاننے کیلئے بات ہوتی رہے گی لیکن آج ایک ایسی تنظیم، ایک ایسی تحریک کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو 1923ء میں ختم ہو جانے والی اِس خلافت عثمانیہ کے دو بارہ دنیا میں قیام کی کوشش کر رہی ہے۔

1953ء میں شیخ تقی الدین العباہی کے ہاتھوں سعودی عرب اور اردن میں تشکیل پانے والی یہ جماعت حزب التحریر کے نام سے معروف ہے اور بقول معروف صحافی اور تجزیہ نگار احمد رشید کے اس وقت ازبکستان، تاجکستان اور دیگر وسطی ایشیائی ریاستوں کی مضبوط ترین زیرزمین تنظیم ہے۔ حزب التحریر ان ممالک کے حکمرانوں کیلئے کتنا بڑا چیلنج ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی بھی دوسری تنظیم سے زیادہ اس کے قیدی اس وقت وسطی ایشیائی ریاستوں کی جیلوں میں ہیں۔ حزب التحریر مسلمان حکومتوں کو تشدد اور ہنگامہ آرائی کے ذریعے ہٹانے کی قطعاً حمایت نہیں کرتی۔ ان کے لٹریچر میں یہ لکھا ہے اور وہ عوامی مقبولیت جیتنے کی خواہاں ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ ایک زمانے میں یہ تحریک اخوان مسلمون سے بھی قریب رہی ہے اور ایک دور میں سعودی عرب کی وہابی تحریک سے قریب ہونے کے بعد بعض ایشوز پر اختلاف کے نتیجے میں اس سے علیحدہ ہو گئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ حزب التحریر کے لٹریچر میں خلافت راشدہ کے بعد آنے والے دور کو ملوکیت سے تعبیر نہیں کیا جاتا بلکہ اس پورے دور کو عثمانی خلافت سے ختم ہونے تک خلافت کہا گیا ہے اس تحریک کے رہنما طالبان، القاعدہ یا ازبک اسلامی تحریک سے کسی بھی تعلق سے انکاری ہیں۔

26 جولائی 2004ء

خودکش حملے اور جہادی تنظیمیں

پاکستانی حکام نے جمعہ ابراہیم نامی ایک اور غیر ملکی کی گرفتاری کا اعلان کیا ہے۔ پچھلے تین سالوں کے دوران دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہونے والے غیر ملکیوں میں سعودی عرب ،افغانستان،مصر،بحرین،یمن،کویت،فلسطین، قطر، سوڈان،تاجکستان، مراکش، بنگلہ دیش، تیونس، شام اور ازبکستان غرض ہر مسلم ملک کے باشندے شامل ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں پکڑے جانے والے یہ افراد افغانستان پر امریکی بمباری کے بعد پاکستان آ گئے تھے بہت سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے جبکہ ایک بڑی تعداد ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہتھے چڑھ گئے اور آج بھی انہیں اسی صورتحال کا سامنا ہے چند کو پوچھ گچھ کے بعد رہا کر دیا گیا جبکہ ایک بہت بڑی تعداد امریکا کے بدنام زمانہ گونتا ناموبے کی طرف بھیج دی گئی ان بھیجے گئے افراد میں بڑی تعداد میں مغربی ممالک کے پاسپورٹ ہولڈرز بھی تھے مثلاً آسٹریلین پاسپورٹ رکھنے والا محمد واحمد حبیب سوڈان کا مہدی غزالی فرانس کا عبدالواصف ، یوسف،علی اور عبداللہ اور سکاٹ لینڈ کا اسلام قبول کرنے والا جمیز الیگزنڈر یاسر حصام مہدی جیسے امریکی مسلمان جن میں 56 سالہ ایک ایروناٹکس ہیں پی

ایچ ڈی کرنے والا ڈاکٹر خالد وسیم بھی تھا ان افراد کی اکثریت آج بھی گونتا ناموبے کے پنجروں میں بند ہے ان گرفتاریوں کے فوراً بعد امریکن سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے دعویٰ کیا تھا کہ گونتا ناموبے میں گرفتار کیے گئے خطرناک ترین لوگ اور القاعدہ کے مرکزی رہنما ہیں لیکنجلد یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ گئی کہ کیوبا کے اس کیمپ میں رکھا گیا ایک شخص بھی القاعدہ کا کوئی مرکزی رہنماء یا طالبان کا کوئی اہم لیڈر نہیں تھا اور تب سے کچھ خوش قسمت جو مغربی ممالک کے باشندے تھے وہ تو اپنی حکومتیں کے دباؤ کے باعث رہائی پا گئے لیکن باقی قیدیوں کی اکثریت کیونکہ مسلم ممالک سے تھی جہاں ان کی حکومتیں ان افراد کو واپس قبول کرنے کو آمادہ نہیں تھیں چنانچہ یہ افراد وہیں بند ہیں لیکن اس کے بعد پاکستان سے القاعدہ کے 4 اہم رہنماؤں مثلاً ابوز بیدہ، خالد شیخ محمد، اور مزی بن شبعی کی گرفتاری کی خبریں بھی آئیں اور یہ تمام افراد بھی امریکی تحقیقی مرگز تک پہنچا دیئے گئے پاکستان میں کئی جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کر کے ان کے قائدین اور کارکنوں کی بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اس کے بعد ملک کے طول عرض میں دہشتگردی کے بڑے واقعات شروع ہو گئے جن میں مغربی مفادات سے وابسطہ تنصیبات کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے مراکز یا شخصیات کو بھی نشانہ بنایا گیا جس کے بعد یہ تاثر تقویت پانے لگا کہ ان کارروائیوں میں ایک نہیں بلکہ مختلف نظریے کے تحت کام کرنے والے بہت سے چھوٹے چھوٹے ایسے گروپس وجود میں آ چکے ہیں جو کسی مرکزی قیادت یا اشارے پر کام نہیں کر رہے ایک طرف تو وہ تنظیمیں ہیں جو افغانستان اور عراق پر ہونے والی امریکی فوجی کارروائیوں کا جواب دینا چاہتی ہیں اور دوسرے طرف وہ گروہ بھی فعاّل ہیں جو بین الاقوامی صورتحال سے قطع نظر اب تک صرف شیعہ، سنی مخالفت پر کمر بستہ ہو کے مساجد اور امام بارگاہوں کو نشانہ بنانے پر تلے ہیں کئی تنظیموں کے کارکنوں نے اس دوران اپنی جماعتوں کے قائدین سے بغاوت کرتے ہوئے ان سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد

نئے ناموں سے کام شروع کر دیا اور صورتحال اس حد تک پیچیدہ ہو گئی کہ کون کہاں سے کس کے رابطوں میں ہے کس کو کہاں سے مدد ملتی ہے اور کون کس سطح پر کیا منصوبے بنا رہا ہے تمام سرتوڑ کوششوں کے باوجود اہم کڑیاں نہ مل سکیں اور نتیجہ صدر مملکت پر ہونے والے حملوں کے بعد کور کمانڈر کراچی اور پھر وزیر خزانہ پر حملوں کی صورت میں ہمارے سامنے آیا اور اب بھی اہم افراد کی گرفتاریوں کے اعلانات کے باوجود ایک عام تاثر یہی ہے کہ لاتعداد افراد اہم شخصیات اور ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی میں اب بھی مصروف ہو سکتے ہیں اور امریکی صدارتی الیکشن سے 90ء روز پہلے جہاں اب ان کے خلاف کارروائیوں میں تیزی آئے گی وہاں خود ان کی طرف سے بھی کارروائیاں زور پکڑ سکتی ہیں پاکستان میں ہونے والی حالیہ گرفتاریاں اور ان کے اعلانات امریکی صدر جارج بش کی انتخابی مہم میں ایک مضبوط سہارا ہونے کے علاوہ خود پاکستان پر بڑھتے ہوئے دباؤ کو زائل کرنے کا بھی سبب بن رہے ہیں جس کا تازہ ترین مظاہرہ عراق اپنی فوج نہ بھیجے جانے کا اعلان بھی کیا ہے۔ گجرات سے گرفتار ہونے والا احمد خلفان 1998ء میں امریکی سفارتخانوں پر حملوں کے بعد سے کسی اور دہشتگردی میں ملوث قرار نہیں دیا گیا۔ وہ اکتوبر 2001ء میں افغانستان پر امریکی بمباری کے بعد وہاں سے بھاگ کے جنوبی وزیرستان آ گیا تھا اور پچھلے دنوں وہاں فوجی آپریشن کے بعد اسے گجرات کی طرف نکلنا پڑا جہاں سے وہ اپنے ایک دوست کی مدد سے پاکستان چھوڑنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ یہ دوست ایک کمپیوٹرائزڈ ٹیکنالوجی میں مہارت رکھنے والا محمد نعیم خان تھا جس کی ٹریول ایجنسی کو کی گئی فون کالز ٹریس ہو گئیں اور 13 جولائی کو گرفتاری سے دو ہفتے بعد اس نے تحقیقاتی اداروں کو گجرات احمد خلفان کے ٹھکانے سے آگاہ کر دیا۔ ابتدائی طور پر یہ کہا گیا کہ امریکا میں دو روز پہلے دہشتگردی کے خطرے کے سلسلے میں دی گئی وارننگ محمد نعیم خان کے کمپیوٹر سے ملنے والی معلومات کا نتیجہ تھی لیکن امریکا میں بھی چند آزاد

ذرائع کا اب یہ کہنا ہے کہ اس کے پاس اس سے ملنے والی اکثر معلومات ستمبر 2001ء سے پہلے اس کی طرف سے جمع کی گئی تھیں لیکن نیویارک اور واشنگٹن کے کئی بڑے تجارتی مراکز کی تفصیلات اور ڈیموکریٹس کے ختم ہونے والے کنونشن کا اثر زائل کرنے کیلئے غالباً وہ کارروائی ضروری تھی جو وہاں کے ہوم سینٹر سیکورٹی کی طرف سے اختیار کی گئی تھی۔ محمد نعیم خان کی گرفتاری افغانستان سے نکل کے یہاں پھنس جانے والے غیر ملکیوں کی مقامی افراد خصوصاً ماضی میں مختلف جہادی تنظیموں سے وابستہ کارکنوں کے باہمی روابط اور دوستیوں کا بھی اظہار کرتی ہے مثلاً گرفتار محمد نعیم خان کا ہی معاملہ لیجئے 25 سالہ محمد نعیم خان عرف ابوطلحہ کا تعلق کراچی سے ہے اس کے والد پی آئی اے میں جبکہ والدہ ایک مقامی کالج میں بوٹنی پروفیسر ہیں۔ محمد نعیم خان جامعہ کراچی سے گریجویشن کرنے کے بعد لشکر جھنگوی سے وابستہ ہوا اور 1998ء میں افغانستان چلا گیا لشکر جھنگوی 1996ء میں سپاہِ صحابہ کے سیکرٹری اطلاعات ریاض بسرا کے اپنی جماعت کی قیادت سے اختلاف کے بعد قائم ہوئی اور ریاض بسرا کا کہنا تھا کہ وہ مولانا حق نواز جھنگوی کے اس مشن کو درست سمت میں لے کر چلے گا جسے سپاہ صحابہ چھوڑ چکی ہے۔ لشکر جھنگوی نے سالار اعلیٰ ریاض بسرا کے ماتحت 12 سالار اور مشاورت کیلئے ایک شوریٰ بھی موجود ہے اور تنظیم کے ہر رہنماء کے نام کے بجائے اس کی کنیت ابوطلحہ تھی۔ لشکر جھنگوی کے اہم ترین کارکنوں کی تعداد چند سو سے تجاوز اس شرط کی بنیاد پر نہ کرسکی کہ تنظیم میں شمولیت کے بعد کارکن کا تمام اہل خانہ سے ہر قسم کا تعلق ختم ہونا لازمی تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں سرگرمیوں کے حوالے سے مختلف یونٹس بنائے گئے اور تنظیم کی بیشتر کارروائیاں پنجاب پر مرکوز رکھی گئیں جہاں گجرانوالہ، راولپنڈی اور سرگودھا براہ راست ریاض بسرا کی کمانڈ میں جبکہ فیصل آباد، ملتان، بہاولپور، بھکر، ملک اسحاق جبکہ کراچی قاری عبدالحی کے کنٹرول میں کام کرنے لگا۔ 27 ستمبر 2000ء کو کابلی کے نزدیک لشکر جھنگوی کے ایک

مرکزی اجلاس میں ریاض بسرا کے علاوہ قاری عبدالحی بلوچ اکرم لاہوری، ذکاء اللہ، ماجد پٹھان، اختر رحمان، آصف رمزی اور تنویر ملتانی خان سمیت اہم رہنما موجود تھے۔ اس اجلاس میں ریاض بسرا نے یہ تجویز رکھی کہ اپنے قیدیوں کی رہائی کیلئے تنظیم کو اگلے چند دنوں میں کن سرگرمیوں کو شروع کرنا ہوگا۔ قاری عبدالحی اور تائی خان ریاض بسرا سے اس نقطہ پر اختلاف رکھتے کہ پاکستان میں ایک فوجی حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد سرگرمیوں کو تیز کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اجلاس میں تلخیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ قاری عبدالحی نے ریاض بسرا سے تنظیم کے مالی معاملات کا حساب طلب کرلیا اور الزام لگایا کہ ریاض بسرا نے کسی طرح تنظیم کے فنڈز کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ تنظیم میں ریاض بسرا کے خلاف باقاعدہ بغاوت ہوگئی اور قاری عبدالحی نے تمام ٹریننگ کیمپوں پر کنٹرول سنبھالنے کے بعد ریاض بسرا سے گاڑیاں بھی اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس کے بعد جب مسلح تصادم تک نوبت پہنچی تو طالبان نے مداخلت کی اور ابوشاغر نامی ایک شخصیت کو دونوں گروپس کے درمیان دوستی کروانے کی کوشش کے لئے کہا۔ عبدالشاغر نے دونوں گروپوں کا اجلاس طلب کیا لیکن ریاضِ بسرا نے اس میں شرکت سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ تنظیم سے قاری عبدالحی کو نکال چکا ہے جبکہ قاری عبدالحی نے الزام لگایا کہ ریاض بسرا کی احمقانہ پالیسی کے باعث کراچی میں اسکا ایک قریبی دوست جو افغانستان سے تربیت لینے کے علاوہ دھماکہ خیز مواد تیار کرنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا یہ وہی تھا جس نے 2 جنوری 1999ء کو لاہور رائے ونڈ روڈ پر تب کے وزیراعظم محمد نواز شریف پر بم دھماکے سے قاتلانہ حملے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ 17 اکتوبر 2001ء کو افغانستان پر امریکی بمباری کے بعد دونوں گروپس سے تعلق رکھنے والے کارکن اور رہنماء پاکستان واپس آ گئے۔ قاری عبدالحی کا حلقہ اثر اوران کا تعلق کراچی سے ہی تھا۔ چنانچہ کبیر والا کے تنویر خان اور کوٹ

عباس کے شکیل احمد سمیت اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ جنوری 2002ء میں لشکر عمر نامی تنظیم کی بنیاد رکھی اور ریاض بسرا کے مارے جانے کے بعد لشکر جھنگوی کے تقریباً تمام اہم رہنماء اس گروپ میں شامل ہو گئے لیکن کچھ ذرائع لشکر عمر کا تعلق جیش محمد سے الگ ہونے والے الفرقان سے بھی بیان کرتے ہیں۔ بہر حال اس تنظیم کی طرف سے پہلا خود کش حملہ 8 مئی 2002ء کو کراچی کے قونصل خانے کے باہر حملہ ہوا جس میں 10 پانچ فرانسیسی باشندوں کی جانیں چلی گئیں۔ پھر 14 جون 2002ء کو کراچی کے قونصل خانے کے باہر حملہ ہوا جس میں 10 افراد مارے گئے اور پھر 28 اکتوبر کو بہاولپور کے ایک گرجے پر حملہ جہاں 17 افراد کی جانیں گئیں وہ بھی اسی گروپ سے وابستہ تھے۔ تاہم 2002ء میں اس تنظیم کے 26 کے لگ بھگ جن میں سر فہرست خود ریاض بسرا تھا پھر 19 دسمبر کو کراچی کے صنعتی علاقے کورنگی کیمیکل ویئر ہاؤس میں دھماکوں میں آصف رمزی سمیت 7 دیگر افراد مارے گئے اور 17 جون اورنگی کراچی سے ریاض بسرا کی جگہ سنبھالنے والا اکرم لاہوری بھی گرفتار ہو گیا۔ جبکہ 24 مئی 2003ء کو قاری عبدالحی کو ملتان سے 60 میل مغرب میں مظفر گڑھ کے ایک بس سٹاپ سے تب گرفتار کیا گیا جب وہ کراچی جانے والی ایک بس میں سوار ہوئے ان تمام گرفتاریوں اور ہلاکتوں کے باوجود حالیہ دنوں میں ہونے والے واقعات میں ان تمام تنظیموں یا گروپوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی اس اہلیت کو ظاہر کر دیا ہے۔ کیمرے کی جس آنکھ سے شوکت عزیز صاحب پر ہونے والے قاتلانہ حملے کو آپ دیکھ چکے ہیں بہت سے سوالات ہیں جو کہ حل طلب ہیں؟

4 اگست 2004ء

دینی مدارس اور مغرب کا شر انگیز پروپیگنڈا

السلام علیکم!

اس وسیع و عریض کمرے میں بے شمار بچے زمین پر بیٹھے قرآن شریف حفظ کر رہے ہیں جن کی عمریں چھ سات برس سے لے کر تیرہ چودہ برس تک کی تھیں اور ان میں سے کسی کو وہاں میری یا میری کیمرہ ٹیم کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں اس قدر توجہ اور انہماک اتنی کم عمر کے بچوں میں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ با آواز بلند آیات تلاوت کرتے ہوئے ایک مخصوص انداز میں حرکت کر رہے تھے جو غالباً کچھ بھی حفظ کرنے کے لئے ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کراچی کے سائیڈ علاقے میں واقع جامعہ بنوریہ ہے جہاں پچھلے دنوں ایک بم دھماکے میں 9 افراد ہلاک ہو گئے تھے ان بچوں کی اکثریت ان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے جو کسی اور درسگاہ میں اپنی اولاد کو تعلیم دلانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تاہم کچھ بچے ایسے بھی ہیں جو طبقہ امراء سے تعلق رکھنے کے باوجود مذہبی تعلیم کو بہتر اور لازم تصور کرنے والے والدین کی طرف سے یہاں بھیجے جاتے ہیں۔ کئی بچے جو قرآن شریف حفظ کر چکے ہیں وہ دس گھنٹوں میں اس کے 77 ہزار 9 سو 34 الفاظ کی قرأت کر سکتے ہیں۔ کئی یتیم بچے بھی یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور پاکستان میں ان دینی مدارس کے علاوہ کوئی ایسا دوسرا نظام نہیں جہاں اتنی

بڑی تعداد میں بچوں کو تعلیم کے علاوہ طعام و قیام کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے بچے دیگر مغربی درسگاہوں میں پڑھنے والے طلباء سے قطعاً مختلف ہیں۔ مجھے کہیں اچھل کود کرتے بھاگتے دوڑتے شور مچاتے بچے نظر نہیں آئے۔ اس کی وجہ حد درجہ ڈسپلن کے نتیجے میں کسی حد تک پایا جانے والا وہ خوف بھی تھا جو انتہائی کم عمر بچوں کو اس طرح خاموش رکھنے کا سبب رہا ہوگا۔ ایک چھوٹے سے بچے نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں قرآن حفظ کر کے اپنے والد کے خواب کو سچا ثابت کرنے جا رہا ہے جن کی ہمیشہ خواہش رہی کہ ان کا کم سے کم ایک بیٹا حافظ قرآن بنے۔ بچے نے فخر سے مجھے بتایا کہ اس کے اس عمل سے اس کے والدین اور اگلی سات نسلیں حدیث مبارک کے مطابق جنت کی اہل ہوں گی۔ بیشتر مدارس میں رہائشی سہولیات جن کا معیار درسگاہوں میں مختلف ہے ایک کمرے میں چار اور کہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں 12 طلباء تک رہائش پذیر ہوا کرتے ہیں۔ پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد دیگر درسگاہوں سے تقریباً 3 سو فیصد زیادہ ہے۔ 1947ء میں تقسیم ہند سے پہلے پورے برصغیر میں ڈھائی ہزار دینی مدارس تھے تاہم صوبہ پنجاب میں آج 10 ہزار رجسٹرڈ مدارس ہیں جبکہ پورے ملک میں ان کی تعداد 25 ہزار کے لگ بھگ ہے جہاں اس وقت تقریباً 16 لاکھ طلباء زیر تعلیم ہیں۔ اس کے علاوہ 25 سے 40 ہزار مدارس ایسے بھی ہیں جو رجسٹرڈ نہیں اور وہاں بھی طلباء کی تقریباً اتنی ہی تعداد یعنی 17.16 لاکھ دینی تعلیم سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ ان مدارس کی مختلف ذریعہ آمدنی ہے۔ بہت سے مخیّر حضرات دنیا بھر سے ذاتی حیثیت میں مدارس کی امداد کرتے ہیں جبکہ ماضی میں کئی ممالک کی حکومتیں مثلاً سعودی عرب، ایران، لیبیا اور یونان وغیرہ ان مدارس کو فنڈز فراہم کرتی رہی ہیں کئی مدارس ان خیراتی اداروں کے

زیراہتمام بھی چل رہے ہیں جہاں چندہ' صدقہ' زکوۃ اور خیرات وغیرہ کی صورت میں رقم حاصل کی جاتی ہے۔ کچھ غیر ملکی طلباء اور قابل استعداد ملکی طلباء یہاں تعلیم حاصل کرنے کی فیس بھی دیتے ہیں۔ بہت سے مدارس کو مضبوط سیاسی' مذہبی جماعتوں کی بھرپور حمایت بھی حاصل ہے خصوصاً جماعت اسلامی' جمعیت علمائے اسلام' تحریک جعفریہ پاکستان اور دیگر کئی سیاسی جماعتیں مختلف مدارس کا نظم ونسق سنبھال رہی ہیں جن میں سے جماعت اسلامی' جمعیت علمائے اسلام اور مختلف شیعہ تنظیمیں 60 فیصد مدارس کو کسی نہ کسی انداز میں کنٹرول کرتی ہیں لیکن کیونکہ قانوناً کوئی سیاسی جماعت براہ راست کسی مدرسے کا انتظام نہیں سنبھال سکتی اس لئے ان کا اثر و رسوخ ان مذہبی جماعتوں کے نظریے یا فقہ کے تحت ہوتا ہے چنانچہ یہ مدارس بریلوی' حنفی' اہل سنت' اہلحدیث' اہل تشیع یا جماعت اسلامی کے نظریات اپنائے جانے کے ذریعے اپنی متعلقہ سیاسی' مذہبی جماعت سے وابستہ ہو گئے۔

حکومت کی ان مدارس کی اصلاح کے لئے کی جانے والی متعدد کوششیں اس تاثر کی بنا پر ناکام ہو گئیں کہ ایسا امریکہ اور مغربی قوتوں کے اشارے پر کیا جا رہا ہے۔ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے اسلامی ذہنوں کو مغربی تہذیب اور استعمار کے خلاف ایک بڑا خطرہ سمجھتے ہیں تاہم اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ بلاشبہ ان مدارس میں کسی ایسے نظام کے تحت اصلاح ضرور درکار ہے جس کے بارے میں غیر ملکی دباؤ کا تاثر نہ ہو بلکہ وہ صرف یہاں کے طلباء کو ایک بہتر اور روشن مستقبل دئے جانے کے لئے تشکیل دیا جائے اور اسے ترتیب دیتے وقت مغرب زدہ آزاد خیال لبرل اور سیکولر افراد کو دور رکھتے ہوئے دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے ان کے انتہائی قابل احترام اساتذہ اور منتظمین کو دعوت دی جائے جو برسہا برس تک دین کی خدمت کے لئے

خود کو وقف کر چکے ہیں اور جن کی اکثریت خود بھی اس بات سے اتفاق رکھتی ہے کہ بالکل اصلاح ضرور ہونی چاہئے لیکن افہام و تفہیم کے ذریعے چھاپے مار کر دہشت گردی کے لیبل لگا کر اور ہراساں کر کے یا دباؤ ڈال کر نہیں۔ حکومت چونکہ خود اپنے سرکاری تعلیمی اداروں کے بدترین حالات سے چشم پوشی کرتی رہی ہے کیا وہ ان 32,30 لاکھ طلباء کے لئے کوئی متبادل تعلیمی قیام و طعام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میں جتنے بھی مدارس میں گیا جتنے بھی طلباء یا اساتذہ سے ملا انہوں نے امریکہ، بھارت یا اسرائیل کے خلاف پُرتشدد کارروائیوں سے خود کو لاتعلق قرار دیتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ فرقہ واریت ان مدارس میں نہیں خود امریکہ نے پیدا کی ہے اور خود امریکہ نے فرقہ وارانہ تنظیموں اور جہادی گروپس کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اس کی جنگ لڑ سکیں اور صورتحال کی ذمہ داری ان مدارس پر نہیں بلکہ امریکہ اور ماضی کی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پر جاتی ہے۔ خود حقائق بھی ایک مختلف کہانی سناتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں شہید ہونے والے غلام عباس، عارف حسین، عثمان عتیق، مدثر راشد، محمود ریاض، ابو ہاشم، محمد صابر، زاہد محمود اور عبدالستار ان سب کا تعلق دینی مدارس سے نہیں تھا بلکہ یہ زیادہ تر پاکستان کے کرسچن مشنری سکول مثلاً کراچی کے سینٹ پیٹرک، لاہور کے ایچیسن اور کوئٹہ کے سن پیٹرک سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد جہادِ کشمیر میں شامل ہوئے۔ یہ درست ہے کہ مدارس سے بھی تعلیم حاصل کرنے والے بڑی تعداد میں جہاد سے وابستہ ہوئے لیکن اس کا سبب ان مدارس کی تعلیم نہیں بلکہ مختلف طلباء کا اپنا انداز فکر ہے۔

3 ستمبر 2004ء

مسئلہ صدر کی وردی کا اور سیاسی جماعتیں

رکن قومی اسمبلی اے آر ڈی کے صدر اور مسلم لیگ نواز کے قائم مقام سربراہ جاوید ہاشمی کو اسلام آباد کی ایک ڈسٹرکٹ عدالت میں اسی برس 29 اکتوبر کو درج کئے گئے اس مقدمہ میں 23 سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے جس میں ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک ایسا خط دیگر اراکین پارلیمنٹ میں تقسیم کیا تھا جسے ایک جعلی لیٹر پیڈ پر جس پر جنرل ہیڈ کوارٹر یعنی GHQ کی مہر بھی موجود تھی مبینہ طور پر صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف لکھا گیا تھا۔ مقدمہ اس خط کی تقسیم کے دس روز بعد درج ہوا تھا۔ مقدمہ درج ہونے کے کچھ ہی دیر بعد جاوید ہاشمی کو پارلیمنٹ لاجز سے گرفتار کر لیا گیا تھا استغاثہ نے ان کے خلاف 14 گواہ پیش کئے اور مقدمہ تقریباً چھ ماہ جاری رہا۔ اپوزیشن کی تمام جماعتیں بشمول متحدہ مجلس عمل قومی اسمبلی میں جاوید ہاشمی کو لانے کے معاملے پر احتجاج کرتی رہیں لیکن سپیکر چوہدری امیر حسین نے جاوید ہاشمی کا پروڈکشن آرڈر جاری نہیں کیا۔ جاوید ہاشمی ان چھ مہینوں سے پہلے اسی دور حکومت میں ایک سال نیب کے ایک مقدمہ میں بھی سزا کاٹ چکے ہیں۔

جاوید ہاشمی کو یہ سزا جو آج سنائی گئی یہ شہباز شریف کی واپسی کی اجازت دیئے جانے کے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے فوراً بعد سامنے آئی ہے اس فیصلے نے لندن میں میاں شہباز شریف کی وطن واپسی کے ارادوں کو یقیناً دھچکا پہنچایا ہے جو اگلے چند دنوں میں لندن میں اپنی پارٹی رہنماؤں کو بلا کر اس اجلاس میں غالباً ایک بار پھر اب کچھ عرصے تک انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی پر عمل درآمد کا راستہ اپنائیں گے کیونکہ فی الحال اسلام آباد میں انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی اپوزیشن کے اراکین پارلیمنٹ بھی اپنا چکے ہیں۔ انہیں انتظار ہے کہ وردی کی اس بحث کے نتیجے میں ایوان صدر سے کیا حتمی خبر آتی ہے۔

صدر مملکت سے وردی نہ چھوڑنے کا مطالبہ سب سے پہلے پارلیمنٹ میں چند ہفتے پہلے اپنی طویل تقریر میں مسلم لیگ قائداعظم کے رکن اسمبلی غلام سرور خان نے کیا تھا اور تب بیشتر اراکین اسمبلی نے غلام سرور کے کلام کو اس تبصرے اور مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا کہ فی الحال اس قسم کی تقاریر کے نتیجے میں وفاقی کابینہ میں شمولیت کے امکانات صفر کے برابر ہوں گے۔ سرکاری بینچوں کے کسی دور گوشے سے ان کا کوئی ہم نوا میسر نہ آنے کے بعد یہ بیان یادداشتوں سے حذف ہونے کو ہی تھا جب اچانک وفاقی کابینہ میں سینئر وزیر یعنی وزیر دفاع راؤ سکندر اقبال نے جو کہ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے سربراہ بھی ہیں انہوں نے بیان دیا کہ یہ قومی سلامتی کا تقاضہ ہے کہ صدر چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ بھی اپنے پاس ہی رکھیں اور پھر پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ہی وزیر داخلہ فیصل صالح حیات صاحب نے بھی یہی مطالبہ دہرایا کہ اگر صدر نے وردی چھوڑنے کا اعلان کیا تو اس سے ملک عدم استحکام کا شکار ہوسکتا ہے۔ چنانچہ واضح ہوتا گیا کہ وہ تقریر جو غلام سرور نے چند ہفتے پہلے اسمبلی کے فلور پر کی تھی اسے چند پسِ چلمن حلقے اب ایک باقاعدہ اور باضابطہ سیاسی مطالبہ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد وفاقی وزیر مملکت برائے قانون رضا حیات ہراج جن کا تعلق

بھی اسی جماعت پیپلز پارٹی پیٹریاٹ سے ہے، ایک گفتگو میں یہ کہہ دیا کہ صدر مملکت کا 31 دسمبر 2004ء کے بعد چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر موجود رہنا آئین کے خلاف ہوگا اس موقع پر رضا حیات ہراج کی اگلے روز کی گئی وضاحت کے باوجود کابینہ کے اراکین کا اس اہم نقطہ پر تضاد ظاہر ہو چکا ہے۔اور پھر وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے اس معاملے پر اپنا موقف ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ صدر مشرف اپنے وعدے کی پاسداری کرنے والے شخص ہیں اور ہر صورت اس سال 31 دسمبر سے پہلے اپنا وردی اتارنے کا وعدہ پورا کریں گے لیکن پیٹریاٹ کے مطالبے پر غور ہو سکتا ہے چنانچہ واضح ہوا کہ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ جو مسلم لیگ قائداعظم کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کے مدمقابل موجودہ وزیراعظم جمالی کو اب تک بھرپور سپورٹ کرتی رہی ہے ایک مختلف موقف لے کر سامنے آئی ہے۔ صدر مشرف آج رات وزیراعظم ہاؤس تشریف لا کر وہاں عشائیے میں شرکت کے دوران وزیراعظم سے ایک اہم گفتگو کر رہے ہیں اور وہ اس سے پہلے کل رات چوہدری شجاعت حسین اور پنجاب کے وزیراعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی سے بھی اپنے معتمد خاص طارق عزیز صاحب کی موجودگی میں ایک طویل ملاقات کر چکے ہیں تاہم یہ بات اب اہم ہے کہ پیٹریاٹ کے وزراء اور وزیراعظم جمالی کے علاوہ مسلم لیگ قائداعظم کے کسی اور اہم رہنما کی یا رکن اسمبلی کا اس معاملے پر بیان سامنے نہیں آیا کیونکہ صدر کی وردی کا معاملہ وہ نقطہ ہے جس پر ایل ایف او مذاکرات متحدہ مجلس عمل کے ساتھ تین ماہ تک کھٹائی میں پڑے رہے۔ کئی بار مسلم لیگ (ق) کو اس معاملے کی کلیرنس ایوانِ صدر سے نہیں ملی تھی کیونکہ حتمی فیصلہ ظاہر ہے وہیں سے ہونا تھا۔ اب آخر کار دسمبر 2004ء کی تاریخ پر سمجھوتہ ہوا اور 17 واں ترمیمی بل اس شرط کے ساتھ منظور کر لیا گیا تھا جس کے مطابق صدر کو پارلیمنٹ توڑنے جانے کے اختیارات بھی حاصل ہو گئے۔ تاہم اب نیشنل سیکورٹی کونسل کا بل منظور ہونے کے فوراً بعد اس

اہم اور بنیادی نقطہ نے ایک بار پھر سر اٹھایا ہے۔

پیٹریاٹ کے وزیر دفاع راؤ سکندر اقبال کا یہ بھی کہنا ہے کہ جنرل پرویز مشرف ایک منتخب صدر ہیں اور ایک باوردی صدر کے لئے ایک عوامی ریفرنڈم کروایا جا سکتا ہے یعنی ایک بار پھر ہم نے ریفرنڈم کی بات سنی ہے۔ وزیر دفاع کے اس نقطہ نظر سے بہت سے لوگ متفق نہیں ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ صدر اگر وردی نہ چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو انہیں ایک اور آئینی ترمیم پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے منظور کروانی ہوگی اور اس کے لئے انہیں دو تہائی اکثریت کی دوبارہ ضرورت پڑے گی یا دوسری صورت میں اس پارلیمنٹ کو برخواست کرنے کا فیصلہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن فیصلہ جو بھی ہو وہ براہ راست مسلم لیگ قائد اعظم بشمول وزیر اعظم جمالی اور چوہدری شجاعت دونوں کے لئے اس موقع پر ایک سگنل ضرور لایا ہے کہ پسِ چلمن حلقوں کی بحث چھڑوانے کے لئے ان دونوں کا نہیں بلکہ پیٹریاٹ کا انتخاب کیا گیا ہے اور اب ان کی درخواست صدر سے جو بھی ہو اس معاملے پر کم از کم انہیں پیٹریاٹ سے کچھ پیچھے رکھا گیا ہے حسبِ سابق صدر اب اخبارات اور میڈیا میں اس معاملے پر چھیڑی گئی بحث کا بغور جائزہ لیں گے پھر اپنا واضح فیصلہ لے کر سامنے آئیں گے اس دوران یقیناً حکومتی اراکین پارلیمنٹ جوق در جوق صدر سے وردی پہنے رہنے کی درخواست کریں گے اور اپوزیشن دوسری انتہائی سخت سمت میں موقف اختیار کرے گی اور متحدہ مجلس عمل کا اس معاملے پر کیا موقف ہوگا یہ اب تک واضح نہیں خصوصاً قاضی حسین احمد کا جن کا کہنا یہ ہے کہ جب اے آر ڈی کی طرف سے یم ایم اے پر سخت نکتہ چینی ہوتی ہے تو ان کا جواب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ صدر سے وردی چھوڑنے کی تاریخ حاصل کر لینا متحدہ مجلس عمل کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ ایم ایم اے کو غالباً اب یہ بتایا جائے گا کہ ان کے جنوبی وزیرستان کے معاملے پر اور پھر نیشنل سیکورٹی کونسل کے بل پر اختلاف رائے نے حکومت کو ان کے ساتھ ہونے

والے معاہدے کی پاسداری کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے۔ چند حساس حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک نئے آرمی چیف کا تقرر اس موقع پر ایک نئے پاور سینٹر کو جنم دے سکتا ہے اور صدر کو اہم سیاسی فیصلوں مثلاً 58-2/B کے تحت پارلیمنٹ توڑنے کے لئے آرمی چیف کی حمایت درکار ہوگی کیونکہ ماضی میں جب بھی یہ آئینی شق استعمال ہوئی مثلاً 1988ء میں دونوں عہدے صدر ضیاء الحق کے پاس ہی تھے لیکن اس کے بعد اگست 1990ء یا پھر 1993ء نومبر 1996ء اس میں تمام صدور کو آرمی چیفس کی حمایت حاصل ہوتی تھی لیکن 1997ء میں جب جنرل جہانگیر کرامت نے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے خط پر کاروائی سے اور پھر فاروق لغاری کی حمایت سے اجتناب کیا تھا تو چیف جسٹس اور صدر دونوں کو اپنے عہدوں سے الگ ہونا پڑا تھا۔ نئے آرمی چیف صدر کے ساتھ کیا موجودہ سیاسی حکومت کو سپورٹ کریں گے یا متحدہ مجلس عمل اور اپوزیشن کے دوسرے اتحادی اے آر ڈی کے لئے ہمدردی رکھیں گے، یہ بھی حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا چنانچہ جتنی ضرورت صدر کو موجودہ سیاسی سیٹ اپ کی ہے اس سے کہیں زیادہ اس سیاسی سیٹ اپ اس پارلیمنٹ، اس سیاسی حکومت اور حکمران اتحادی جماعتوں کو صدر کی ہے کیونکہ اس میں موجود ہر فعال شخصیت خواہ وہ وزیر ہو یا رکن اس کی قوت کا سرچشمہ ایوان صدر سے ہی جنم لیتا ہے۔

13اپریل 2004ء

وزیرستان میں بڑھتی کشیدگی

السلام علیکم!

قبائلی علاقوں میں تصادم کی نئی لہر اٹھی جس میں لاتعداد افراد لقمہ اجل بنے یہ افسوسناک واقعات ان حکومتی حملوں کے بعد شروع ہوئے ہیں جس میں سرکاری مؤقف کے مطابق جنوبی وزیرستان میں دہشت گردی کے ایک تربیتی کیمپ کو نشانہ بنایا گیا تھا اور وہاں تربیت حاصل کرنے 70 یا 80 کے قریب افراد مارے جانے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا تھا کہ مارے جانے والوں کی اکثریت غیر ملکی یعنی چیچن، ازبک یا عرب تھے۔ کسی آزاد ذریعے نے اس حکومتی دعویٰ کی تردید نہیں کی تاہم اس واقعہ کے بعد مسلح جھڑپوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور لدھا، مانزہ، کارونی اور نارائی کے علاقوں میں مسلح قبائلیوں اور فوج کے درمیان خونی تصادم میں دونوں طرف کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ اس طرح پاک فوج اور قبائلیوں کے درمیان پہلے سے موجود کشیدگی جھڑپوں اور پھر مسلح محاذ آرائی کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی اور وانا اور پشاور سے مختلف ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ایک قافلے کو قبائلیوں کی طرف سے گھیر لیئے جانے کی اطلاعات بھی دی ہیں۔ بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ پاکستان کی تاریخ میں مسلح شورش کو کچلنے کے لئے اس سے پہلے کبھی فضائی بمباری نہیں کی

گئی۔ جنوبی وزیرستان کے علاقہ کارواں' مانزہ میں سیکورٹی اور مزاحمت کاروں کے درمیان جھڑپ میں چھ افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ تفصیلات کے مطابق اتوار کی صبح پانچ بجے کے قریب سب ڈویژن تحصیل لدھا کے علاقے کارواں' مانزہ کے قریب مسلح مزاحمت کاروں نے پاک سیکورٹی فورسز کے کئی مورچوں پر فائرنگ شروع کر دی جس پر جوابی کارروائی کرتے ہوئے سیکورٹی فورسز نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں چھ افراد ہلاک جبکہ عینی شاہدین کے مطابق ایک درجن سے زائد لاشیں دیکھی گئی ہیں۔ آخری اطلاعات تک سیکورٹی فورسز اور مزاحمت کاروں میں فائرنگ کا زبردست تبادلہ جاری تھا۔ اطلاعات کے مطابق پاک آرمی کے گن شپ ہیلی کاپٹروں نے مزاحمت کاروں کے ٹھکانوں پر شدید بمباری کی۔ جس سے متعدد مکانات تباہ ہو گئے ہیں۔ اس کے جواب میں شرپسندوں نے مارٹر گولے فائر کیے اور مشین گنوں سے فائرنگ کی۔ جس میں چھ شرپسند ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔

اب ملکی سیاست پر ایک نظر ڈالتے ہیں جہاں یہ بات تقریباً طے ہوگئی ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف 31 دسمبر 2004ء کے بعد بھی چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن دلچسپ ترین واقعہ یہ رہا کہ ان کا یہ ارادہ کسی بڑی سنسنی خیز خبر کا روپ یوں نہ دھار سکا کہ وہ ایک عرصے سے اپنی اس خواہش کا مبہم الفاظ میں اظہار کرتے رہے ہیں اور عوام کی بھی کثیر رائے ذہنی طور پر محض ایک رسمی حکومتی اعلان سننے کی توقع رکھتی تھی۔ چنانچہ جس ٹی وی چینل سے صدر کی گفتگو میں 96 فیصد عوام کی حمایت کے بیان کے بعد پہلے مسلم لیگ پنجاب اور پھر دیگر حکومتی اراکین وردی نہ چھوڑنے کے مطالبات کے ساتھ سامنے آئے اور اس کے ساتھ مختلف سروے' اخبارات کی زینت' بننے لگے کہ عوام کی اکثریت صدر کے پاس دونوں عہدے رکھنے کی حامی

ہے۔

آنیوالے چند دنوں میں وردی کی حمایت میں قراردادوں کا سینٹ' قومی اور دیگر صوبائی اسمبلیوں میں اس بل کا پاس ہونا لازمی ہے اور یہ تمام بحث ایک طرح سے مناسب وقت پر یوں چھیڑی گئی ہے کہ وائس چیف آرمی سٹاف اکتوبر کے ابتدائی دنوں میں ریٹائر ہونے جا رہے ہیں اور ان کے ریٹائر ہونے کی صورت میں نئے آنیوالوں کا اعلان تبھی ممکن ہے کہ جب صدر چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر موجود رہیں اور پھر یہ بھی طے ہے کہ اگلے چند دنوں میں ان کے دورہ امریکہ کے دوران نہ صرف اہم ترین ملاقاتوں بلکہ ان کی غیر ملکی میڈیا کے ساتھ نشستوں میں بھی ان کی وردی کا معاملہ زیر بحث آنیوالا ہے اور ان موقعوں پر ان کی حمایت میں منظور کی گئی تمام قراردادیں اور رائے عامہ کے شائع ہونیوالے سروے ان کے اس فیصلے کے حق میں پیش کیے گئے دلائل کو حکومتی حلقوں کی طرف سے مضبوطی کے ساتھ پیش کرنے کا سبب ہوں گے۔ صدر مملکت کو یقین ہے کہ ان کے اس فیصلے میں کوئی آئینی رکاوٹ نہیں اور مغرب بھی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے ان کے اس فیصلے کیساتھ توثیق کر چکا ہے۔

لیکن صدر کا سب سے دلچسپ بیان متحدہ مجلس عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد کے بارے میں تھا جس میں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ قاضی صاحب بھی جانتے ہیں کہ صدر آئینی طور پر آرمی چیف اور صدر کے عہدوں پر براجمان رہ سکتے ہیں۔ لیکن وہ عوام کے سامنے یہ کہنے سے ہچکچاتے ہیں۔ قاضی حسین احمد نے اس بیان پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس اقدام کو آئین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے ایسا کرنے کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف آئین سے بغاوت کے مقدمات کا مطالبہ کیا ہے اور ان کا یہ بھی اصرار ہے کہ صدر دسمبر 2003ء میں عوام سے اپنے ٹی وی خطاب میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ

31 دسمبر 2004ء تک اپنا ایک عہدہ چھوڑ دیں گے اور متحدہ مجلس عمل کسی صورت ان سے کیے گئے وعدے سے پیچھے نہیں ہٹنے دیں گے۔ ایم ایم اے کا اب تک یہ موٴقف رہا ہے کہ صدر 17 ویں آئینی ترامیم کے تحت آئین کی دفعہ 63 (1) کی شق بی کے تحت 31 دسمبر کے بعد وردی چھوڑنے کے پابند ہیں لیکن حکومت کو اب یقین ہے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر متحدہ مجلس عمل کی قیادت 17 ویں آئینی ترمیم پر حکومت سے مفاہمت کے دوران آئین کی اس شق یعنی 1-63 کو مکمل طور پر نہ سمجھنے کی غلطی کر سکتی ہے اور دراصل یہ شق جہاں واضح طور پر یہ کہتی ہے کہ کسی بھی ایسے منافع بخش عہدے پر فائز نہیں رہا جا سکتا سوائے اس عہدے کے جسکا تعین قانون نے کیا ہو اور جو اس عہدے کے حامل کو نااہل قرار نہ دیتا ہو 17 ویں ترمیم کا آرٹیکل 7 کے تحت صدر کو تمام دیگر دفعات سے مستثنیٰ قرار دے دیتا ہے کہ اس آرٹیکل یا آرٹیکل 43 یا ان کی کوئی بھی دوسری شق کسی بھی دوسرے نافذ العمل قانون کے باوجود صدر مملکت فوراً صدر پاکستان کے عہدے پر فائز ہونگے اور آئین کے تحت پانچ سال تک اس عہدے پر برقرار رہیں گے۔ اس طرح آرٹیکل 41-B کی یہی شق صدر کے عہدے کو آئین سے بالاتر قرار دیتی ہے اور دلچسپ ترین بات جس کی نشاندہی سب سے پہلے پیپلز پارٹی کے ممتاز آئینی ماہر اور سابق وفاقی وزیر چوہدری اعتزاز احسن نے کی تھی وہ یہ تھی کہ یہ شق چونکہ 1973ء کے اصل اور غیر ترمیم شدہ آئین میں موجود ہے اس لئے صدر کو اپنے فیصلے کی توثیق کیلئے دو تہائی نہیں بلکہ ایوان میں صرف سادہ اکثریت کی حمایت درکار ہوگی۔

14 ستمبر 2004ء

وی وی آئی پیز شخصیات اور بے حس عوام

السلام علیکم!

بڑے بزرگ درست کہا کرتے تھے کہ جو گھر خالی پڑا رہے وہاں جن بھوت بسیرا کرلیا کرتے ہیں چنانچہ جو بستیاں کسی پردھان سے محروم ہوں وہ خلفشار' بدامنی اور انارکی کا شکار نظر آتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کا گریبان چاک کرتے ہیں اور پگڑیاں فضاؤں میں اچھلتی یا قدموں تلے روندتی نظر آتی ہیں' الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں اور سلجھانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس لئے ایسی بستیوں میں بدنظمی' راج کیا کرتی ہے اور زندگی عذاب بن جایا کرتی ہے۔

پچھلے برس ہمارے دیس میں 3 ہزار ایک سو 23 انسان ہماری بے حسی اور بے مروتی کے ہاتھوں خودکشی کر گئے۔

میں یہاں میلے کچیلے' پھٹے کپڑوں میں ملبوس گندگی کے ڈھیر میں رزق تلاش کرتے بھوک سے نڈھال انسانوں کی نہیں ان کی بات کر رہا ہوں جو اس مملکت خداداد کے قائدین کی طرف سے ہر روز روشن مستقبل کی پیشینگوئیوں سے مایوس ہو کر اپنے دکھوں کی صلیب پر لٹک گئے ہر طلوع ہوتا سورج نو انسانوں کو جانیں دیتا دیکھتا رہا ہر ڈھائی گھنٹوں کے بعد کسی کا کرب کسی کی شکایت' کسی کا گلہ شکوہ کسی کی درخواست اپیل'

احتجاج اسکی آخری ہچکی کا روپ دھار گئی۔ یہ دو ہزار 8 مرد اور ایک ہزار 75 عورتیں یہ سب نوجوان تھے۔ جن کی دنیا شاید ہم سے مختلف تھی اور اس لئے ان کی چیخیں ہماری آسائشوں میں دخل نہ ڈال سکیں۔ ان کی آہیں ہماری گاڑیوں کے بند شیشوں سے ٹکرا کر واپس لوٹتی رہیں اور ان کے آنسو کسی ایوان کا پوائنٹ آف آرڈر نہ بن سکیں۔ بہت ناکام بہت دشوار بہت بھاری زندگی نے ایک دن پھر انہیں اپنے ہی وزن تلے کچل کر رکھ دیا اور نہ تو کسی کے چہرے پر کوئی ملال آیا نہ کسی تقریب کا رنگ پھیکا پڑا اور نہ ہی کوئی معاشی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ایک لمحے کو ہچکچایا۔

یہ کون سی دنیا ہے جو اس خوشحال بستی میں سسکیاں لیتی ہے پر ہجوم ہوٹلوں کے اردگرد کھڑی گاڑیاں اور ان کی میزوں کے خالی ہونے کا انتظار کرتی قطاروں سے پرے وہ تاریک سائے کن کے ہیں جو پلیٹوں میں چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر ماس تلاش کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ جابجا کھلے ہوئے مہنگے تعلیمی اداروں میں جدید زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے امیرزادوں کی سگنل پر رکتی گاڑیوں کو صاف کرتے یہ بونے کون ہیں؟

عالیشان اور قہقہوں سے بجی شاہراہوں' اخباری نمائندوں اور ٹی وی کیمروں کے سامنے تالیوں کی گونج میں ہر روز افتتاح ہوتے انڈر پاسز اور ہیڈ بریجوں سے پرے جھگیوں کے درمیان کنستر' ڈبے اور گھڑے سروں پر اٹھائے پانی کھلنے کا انتظار کرتی مخلوق کون ہے؟

جتنی تعداد میں نئی گاڑیاں اتنے ہی زیادہ انہیں گھیرتے بھکاری۔ جتنا سخت احتساب اتنا ہی رشوت کے ریٹ میں اضافہ' صحت کے لئے بجٹ میں اضافہ نئے ہسپتال گلی محلوں میں کھلتے میڈیکل کالج اور ہسپتالوں کے برآمدوں میں ایڑیاں رگڑتے

مریض کہیں فارن ٹورز میں نام ڈلوانے کے لئے سفارش کی جا رہی ہے اور کہیں یہ فیصلہ دشوار ہو رہا ہے کہ تپتی دھوپ میں رکشہ روک لیا جائے یا بس کے دروازے سے لٹک کر دو روپے بچا لئے جائیں۔

ایک ہی جہاں میں اگر آپ نے دو دنیاؤں میں اگر ایک نظارہ ملاحظہ کرنا ہے تو شہر کراچی کی کسی بھی اہم اور بڑی شاہراہ پر نظر ڈال لیں۔

سرکار نے خوشخبری سنائی ہے کہ عوام کی قسمت جاگ اٹھی کہ شہر میں ایک نمائش ہو رہی ہے جس میں شرکت کے لئے کئی وی آئی پیز' وی وی آئی پیز اور متعدد غیر ملکی یعنی کئی بار وی وی لگانے کے بعد آئی پیز نے ان کے شہر کو عزت بخشی ہے۔ نمائش گاہ کا دورہ کرتے معززین کو ہم ٹی وی اور اخبارات میں دیکھ رہے ہیں لیکن خواص کی اس نمائش سے پرے عوام کے لئے شہر کی ہر سڑک پر ایک الگ الگ نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر طرف ٹریفک میں پھنسی گاڑیاں' بند سگنل' رکاوٹیں کھڑی کر کے بند کی گئی سڑکیں' فضاء میں گردش کرتے ہیلی کاپٹرز' سرکار نے روائتی تعاون پر عوام کا شکریہ ادا کیا ہے اور عوام کا بیان یہ کہ یہ اس روائتی تعاون کا تذکرہ ہے جو وہ گالیوں کی صورت میں پچھلے 57 سالوں سے اپنے حکمرانوں کو دے رہے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ عوام کے مفاد میں کیا جا رہا ہے اور لکی سٹارز سے ٹیکسی میں سوار سعیدہ آباد کا رہائشی جاوید خان چیختا ہے کہ وہ اپنے والد کو لیکر جناح ہسپتال جا رہا تھا کہ انہیں دمے کی شدید تکلیف تھی۔ جاوید خان نے قانون نافذ کرنیوالے ادارے کے اہلکاروں کو بتایا کہ ہم نے جناح ہسپتال کی ایمرجنسی میں جانا ہے لیکن اہلکاروں نے ہتک آمیز انداز میں خاموش کرا دیا اور اسے ڈیڑھ گھنٹے بعد وی وی آئی پیز کے گزرنے کے بعد جناح ہسپتال جانے کی اجازت دی گئی۔ انتظامیہ کہتی ہے کہ اس قسم کی تقریبات ہمارے وقار میں اضافے کا

سبب ہیں اور جناح ہسپتال سے آغا خان ریفر ہونے والے مریض ارشاد کے گھر والے چیختے ہیں کہ وہ ایمبولینس میں جناح ہسپتال سے نکلے تو کالا پل سے شاہراہ فیصل تک ٹریفک جام تھی کیونکہ لوہے کی زنجیر سڑک پر لگا کر ریجن پلازہ کی چورنگی پر ٹریفک روک دی گئی تھی اس لئے ارشاد کے گھر والے اسے کندھے پر اٹھا کر جناح ہسپتال سے ریجن پلازہ تک لائے۔ ڈیڑھ گھنٹے وہ وہیں کہیں پڑا سسکتا رہا اور پھر جب ٹریفک کھلی تو اسے ٹیکسی میں ڈال کر آغا خان ہسپتال لے جایا گیا۔

انتظامات قابل داد ہیں اور انتظامیہ تبھی داد کی مستحق ٹھہرتی ہے جب کسی بڑی شخصیت کو کوئی تکلیف نہ پہنچے' کسی وی آئی پی کی گاڑی 120 سے کم سپیڈ میں شاہراہ فیصل سے نہ گزرے' کسی مرسڈیز کے مسافر کے ذوق پر آس پاس کوئی دھواں اڑاتی بس کوئی بغیر سائلنسر رکشہ اور خاندان بھر کے وزن سے کانپتا سکوٹر ناگوار نہ گزرے۔ کیا زناٹے دار سائرن بجا کر اتنی تیزی سے گزرتی گاڑیوں تک کہ آنکھ تک نہ جھپک پائے اردگرد کے بے یار و مددگار انسانوں کا کوئی منظر پہنچ پاتا ہے۔

ہر سو گز پر مسلح دو پولیس والے جدید ترین اسلحہ کمیونیکیشن کے حساس ترین آلات۔ لیکن آپ اپنے تھانے کے علاقے میں فون کر کے بتائیں کہ میں ایک ٹیکس دینے والا معزز ایماندار اور پر امن شہری بات کر رہا ہوں مجھے فوراً آپ کی مدد چاہئے تو غالب امکان یہ ہے کہ تھانے سے آپ کو جواب یہ ملے گا کہ جناب آج ہمارے پاس نفری نہیں۔ آپ کی حفاظت کیلئے' ایک پولیس والا' ایک رائفل' ایک کارتوس نہیں ہے۔ لیکن آپ کے ٹیکس اور محنت مزدوری کے نتیجے سے وجود پاتے خزانے سے ان کی حفاظت ہوتی ہے جو آپ کی حفاظت کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔

ایک سابق وی آئی پی سے پوچھا گیا کہ جناب جب آپ برسرِ اقتدار تھے تو

آپ کی آمد اور رخصتی پر شہر کی تمام بڑی سڑکیں بند کر دی جاتی تھیں لیکن آج جب آپ ایک ڈرائیور کے ساتھ اکیلے گھومتے ہیں تو آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ سابق وی آئی پی نے یہ سن کر مسکرا کر جواب دیا کہ جناب سڑکیں سیکورٹی کے لئے نہیں بلکہ پروٹوکول کیلئے بند ہوتی ہیں سارا کمال اور جادو تو ہوٹر میں ہوتا ہے تمہاری گاڑی کے آگے کبھی ہوٹر بجا ہو کبھی تمہارے لئے ٹریفک بند ہوئی ہو کبھی تمہیں کسی پولیس والے نے سلوٹ کیا ہو تو تمہیں اندازہ ہو کہ یہ کتنی بڑی نعمت اور کتنا بڑا انعام ہوتا ہے۔

دیہات میں لوگ اس کیکر کی بھی حفاظت کرتے ہیں جو انہیں مسواک دیتا ہے لیکن ہمارے ان وی آئی پی حضرات کو سڑکوں کے کنارے مرنیوالے ان انسانوں کا خیال نہیں آتا کہ ان کے اخراجات اپنی پھٹی جیبوں سے پورا کرتے ہیں جو انہیں عزت اور اختیار دیتے ہیں۔

ایسے میں اسلام آباد سے مزید 4 وی آئی پیز شامل ہوئے ہیں ہر وفاقی وزیر یا وزیر مملکت کا کم سے کم سرکاری خرچہ جس کا وہ قانونی طور پر حقدار ہے ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ ہے ہر وفاقی وزیر کی تنخواہ اس وقت چالیس ہزار روپے ماہانہ رہائش اگر وہ سرکاری نہیں ہے تو 40 ہزار روپے فرنشڈ گھر گاڑیاں ہوائی سفر کے لئے ٹکٹ فری پٹرول ڈرائیور اور بہت سی سہولیات بے حس قوم کے لہو سے حاصل ہونیوالی دولت سے ان لوگوں پر خرچ کئے جائیں گے۔

15 ستمبر 2004ء

وردی کا مسئلہ اور تاریخی پس منظر

عجب تماشہ ہے کہ پنجاب اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کی کہ صدر جنرل پرویز مشرف ملک میں سیاسی انارکی اور معاشی ابتری پھیلانے والوں کی سوچ رکھنے والوں کی پروا نہ کرتے ہوئے قومی سلامتی کے تقاضوں اور وسیع تر عوامی مفاد میں اکثریتی رائے ملحوظ خاطر رکھ کر وردی نہ اتارنے کا فیصلہ کریں' اور دونوں عہدے اپنے پاس رکھیں تاکہ دہشت گردی کے خلاف اور معاشی استحکام کی پالیسیوں میں تسلسل برقرار رہے۔ ملک کے ایک دوسرے صوبے یعنی سرحد کی اسمبلی پنجاب اسمبلی کی اس منظور کی گئی قرارداد کو آئین کی خلاف ورزی تصور کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ صدر پاکستان 31 دسمبر کے بعد صدر یا چیف آف آرمی سٹاف میں سے کوئی ایک عہدہ اپنے پاس رکھنے کے مجاز ہونگے اس لئے وہ صدر سے آئین اور عوام سے کئے گئے اپنے وعدے کی پاسداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ہماری ملکی سیاست کا ایک دلچسپ موڑ ہے کہ اب سندھ اسمبلی پنجاب کے نقش قدم پر چلے گی اور بلوچستان سرحد کی تقلید کرے گی' تاہم میچ ڈرا یوں قرار نہیں پائے گا کہ قومی اسمبلی کے 92 اراکین کی اکثریت اور سینٹ' پنجاب اور سندھ سے آنے والی قراردادوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں گے۔ اس طرح وفاقی وزیر پارلیمانی امور کا وہ دلچسپ بیان بھی درست ثابت ہو جائے گا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ وردی کے

بارے میں صدر خود فیصلہ نہیں کریں گے بلکہ یہ فیصلہ پارلیمنٹ اور عوام کرے گی اور اس سلسلے میں اپوزیشن کو بھی اعتماد میں لیا جائے گا۔

وطن عزیز کے دو صوبوں میں خالصتاً سیاسی ایک میں خالصتاً مذہبی جبکہ چوتھے میں دونوں کے امتزاج سے حکومت قائم ہے۔ ہمارے ہاں الیکشن میں سیاسی اور مذہبی دونوں ہی قسم کی جماعتیں اقتدار کے حصول کے لئے کوششیں کرتی ہیں۔ ایک جانب مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر لوگوں کے جذبات اور احساسات کو استعمال کر کے اقتدار کی راہیں ہموار ہوتی ہیں تو دوسری طرف تدبیر سازشوں مسلح طاقت اور اجتماعی خواہشات کے ذریعے مقاصد کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہماری پوری تاریخ کبھی سیاست کو مذہب کے تابع دیکھتی رہی ہے اور کبھی مذہب کو سیاست کے تابع مثلاً عباسی خلافت کی کمزوری اور زوال کے نتیجے میں جب صوبائی خود مختار حکمران خاندان ابھرے تو انہوں نے بادشاہت کے ادارے کو روشناس کرایا۔ اس ادارے کو مسلمان فقہاء اور مفکرین نے اس دلیل کی بنیاد پر تسلیم کر لیا کہ اس کی وجہ سے معاشرہ بدامنی اور لاقانونیت سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ ممتاز عالم دین الموروں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اگر کوئی طاقت اور فوج کی مدد سے اقتدار پہ قبضہ کرے اور غاصبانہ طور پر حکومت پر قابض ہو جائے تو اسے جائز حکمران اس بنیاد پر تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ دوسری صورت میں خانہ جنگی اور ابتری کا اندیشہ ہوتا ہے' چنانچہ جب بادشاہ کے ادارے اور طاقت سے اقتدار کے حصول کو جائز تسلیم کر لیا گیا تو مسلمان مفکرین کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بادشاہ کی حیثیت کا تعین کس طرح کیا جائے۔ کیا بادشاہ مذہب کے تابع ہوگا یا مذہب اس کے مقاصد کی تعمیل کریگا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ اس سوال کا تفصیلی جواب دیتی ہیں۔ ان کتابوں میں نظام الملک کا سیاست نامہ' امام غزالیؒ اور ضیاء الدین

برنی کی کتب مشہور ہیں۔ یہ تمام تحریریں بادشاہت کے ادارے اور اس کے موروثی عنصر کو تسلیم کرتے ہوئے بادشاہ کو ظل اللہ کا درجہ دے کر اسے خودمختار قرار دیتی ہیں۔ ان دانشوروں کا ماڈل ساسانی بادشاہ تھا جس کی ذات میں سیاسی اور مذہبی دونوں اختیارات ہوا کرتے تھے لہٰذا بادشاہ کے اختیارات اور لامحدود طاقت کو مذہب کی بجائے اخلاق کے ذریعے کنٹرول کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کی سب سے بڑی خوبی عدل قرار دے کر ایرانی بادشاہ نوشیرواں کو بطور علامت پیش کیا جانے لگا۔ ہندوستان میں سلاطین نے اس طریقۂ کار کو جاری رکھا لیکن مغل حکمرانوں یعنی اکبر نے جس نظریہ بادشاہت کو اختیار کیا وہ قدرے مختلف تھا۔ اس نظریے کی بنیاد ابوالفضل نے فراہم کی اور اس کے مطابق خدا کے نزدیک مرتبہ شاہی سے زیادہ بلند اور کوئی مقام نہیں کیونکہ اس کے ذریعے دنیا میں سرکشوں کو زیر کیا جاتا ہے اور بغاوتوں کا خاتمہ کر کے انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلایا جاتا اور دراصل یہ بادشاہی جاہ و جلال ہی ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں کسی حد تک بدامنی اور فساد کم ہے۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں مزید لکھتا ہے کہ بادشاہت کی روشنی خدا کی ذات سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور کہتا ہے کہ یہ مرتبۂ شاہی خدا کی طرف سے کسی برگزیدہ شخصیت کو ملتا ہے جس پر وہ اعلیٰ نور چھا جاتا ہے جس سے وہ مرعوب ہو کے نوع انسانی کو اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آئینِ اکبری کے مطابق بادشاہ کو چونکہ الٰہی روشنی ملتی ہے اس لئے علماء اور مجتہد اسکے درمیان دخل نہیں دے سکتے۔ اکبر نے اپنے اختیارات آئینِ اکبری کی روشنی میں اتنے وسیع کر دیئے کہ جب اس کے صدر صدور عبدالنبی نے ایک برہمن کو توہین رسالت کے جرم میں واجب القتل قرار دیا تو اکبر نے ابوالفضل کے والد شیخ مبارک سے کہا کہ وہ اس کی رہنمائی کریں کہ وہ ان علماء سے کس طرح نجات پا سکتے ہیں۔ اس پر شیخ مبارک نے مشورہ دیا کہ بادشاہ کو چاہیے

کہ وہ مجتہد کے اختیارات بھی حاصل کر لے۔ چنانچہ 1579ء عیسوی میں اکبر نے تمام علماء سے ایک دستاویز پر دستخط کروائے جس کے بعد علماء مجتہد اس کے ماتحت ہو گئے اور بادشاہ کی ذات میں دنیاوی اور مذہبی اختیارات دونوں شامل کر دیئے گئے۔ اسی دوران ایک اور بڑے عالمِ وقت ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب میں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ لکھا کہ بادشاہ کے لئے مشکل ہے کہ وہ شرعی قوانین کے تحت حکومت کرے کیونکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جاہ و جلال' شان و شوکت فخر و تکبر کو قائم رکھے اس لئے دربار کی رسومات جن میں سجدہ کرنا یا قدم بوسی کرنا اور دیگر مثلاً عالیشان محلات میں رہنا' خزانے کو مال و دولت سے بھرنا اور اسے ذاتی استعمال میں لانا یا فضول خرچی کرنا یہ سب مجبوراً جائز ہے' کیونکہ بادشاہ کا احترام تبھی ہو سکتا ہے جب اس کے پاس دولت' شان و شوکت اور عظمت ہو۔ چنانچہ بادشاہ چونکہ ظل اللہ اور نائب خدا قرار پا گیا' اس لئے اس کے خلاف جو بغاوت ہوتی تو باقی اس کے مجرم ہوتے چنانچہ انہیں اذیتیں دینا' جسم کے ٹکڑے کرنا اور پھانسی پہ لٹکانا یہ سب بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا۔

16 ستمبر 2004ء

وردی، وردی اور..........!

السلام علیکم!

وردی کا تنازعہ جس قدر تیزی سے اٹھا، اتنا ہی جلد حل ہوتا بھی نظر آ رہا ہے۔ قوم اور سیاست دان ذہنی طور پر صدر جنرل پرویز مشرف کو 31 دسمبر 2004ء کے بعد بھی دونوں عہدے اپنے پاس رکھے دیکھ رہے ہیں اور بظاہر آئینی، سیاسی یا بین الاقوامی حالات صدر مملکت کے موافق نظر آ رہے ہیں۔ متحدہ مجلس عمل اور اے آر ڈی دونوں اپوزیشن اتحاد انتہائی بے بسی سے خود کو اس اہم ترین محاذ پر پسپا ہوتے دیکھ رہے ہیں جس کیلئے انہوں نے ڈیڑھ سال تک پارلیمنٹ کا نظام درہم برہم رکھا یعنی صدر کی وردی کا تنازعہ پھر پچھلے سال کے اختتامی دنوں میں متحدہ مجلس عمل اور حکومت کے درمیان ایل ایف او پر معاہدے کے بعد پارلیمنٹ کا کاروبار تو احسن طریقے سے چلنے لگا لیکن متحدہ مجلس عمل حکومت سے مفاہمت کے الزامات کے جواب میں مسلسل اس نقطۂ نظر کی داعی رہی کہ اس نے حکومت کو وردی چھوڑنے کی تاریخ پر راضی کر کے ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور یہ کہ صدر جنرل پرویز مشرف کے پاس 31 دسمبر تک وردی چھوڑنے کے علاوہ قطعاً کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا اور یہ دینی اتحاد کی موجودہ بحران کے خاتمہ کیلئے کی گئی ایک کامیاب جدوجہد تھی۔ اے آر ڈی کا موجودہ نظام سے کوئی مفاد وابستہ نہیں

بلکہ شاید اس نظام کا بوریا بستر لپیٹ دیا جانا ہی ان کے لئے بہترین آپشن ہے لیکن متحدہ مجلس عمل جس کے پاس اس وقت قومی اسمبلی میں قائد حزب کے عہدے کے علاوہ دو صوبوں کی حکومتیں بھی ہیں وہ اس تاثر کو زائل کرنے میں اب شدید مشکلات کا شکار ہو جائیں گے کہ وہ فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کیلئے ایک خاص حکمت عملی تیار کرتے رہے ہیں۔ انہیں اس تنقید کا بھی سامنا ہوگا کہ وہ ایل ایف او کو صدر کی وردی کی شق کے ساتھ منظور کروا کے یعنی حکومت کو ایک انتہائی سہل اور آئینی راستہ دکھانے کے ذمہ دار بھی رہے ہیں۔ پارلیمنٹ غالباً اگلے کچھ ہی عرصے میں ایک ایکٹ آف پارلیمنٹ کے ذریعے صدر کو دونوں عہدے اپنے پاس رکھنے کا آئینی حق دینے کی قرارداد سادہ اکثریت سے منظور کرنے جا رہی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ صوبائی اور قومی اسمبلی اور سینٹ کی منظور کردہ قراردادوں کے باوجود صدر مملکت اپنے حتمی فیصلے سے قوم کو دورہ امریکہ سے واپسی کے بعد ہی آگاہ کریں گے۔

اس تازہ ترین صورتحال نے حکومت کو تازہ دم کر دیا ہے لیکن اپوزیشن مزید دیوار سے جا لگی ہے لیکن خود پارلیمنٹ کے اندر اور باہر حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والے اراکین اور وزراء گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے انتہائی سرد رویوں کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ نئے جوان چہرے تو شاید ابھی اپنے دفاتر' گاڑیوں' سٹاف کے چکر میں ہی گھوم رہے ہیں لیکن پرانے سیاسی چہروں پر کرب کی لکیریں صاف طور پر پڑھی جا سکتی ہیں جیسے انہیں اندازہ ہو رہا ہے کہ کھیل کے اس مرحلے پر سیاستدان غالباً ایک محدود کردار ادا کرنے جا رہے ہیں اور نئے مہرے پرانوں کو پیٹ کر بساط پر بادشاہ کے گرد حصار بنانے کو بیتاب ہیں۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے وردی سے متعلق فیصلے پر ملک کے

طول و عرض میں سیاسی، صحافتی اور قانونی حلقوں میں بحث جاری ہے اور وزیراعظم شوکت عزیز نے بھی صدر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ملکی مفاد اور استحکام کے لئے وردی نہ چھوڑیں لیکن اس عام معاملے پر امریکہ کی طرف سے کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں ہوا بلکہ وائٹ ہاؤس کے ترجمان رچرڈ باؤچر نے کہا ہے کہ ہم اس معاملے پر بعد میں اپنے تاثرات کا اظہار کریں گے۔ صدر مشرف اگلے چند دنوں میں اپنے دورہ امریکہ کا آغاز کرنے والے ہیں اور تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ پاکستان میں مختلف حکمران حلقے صدر سے وردی رکھنے کا مطالبہ تو کر رہے ہیں تاہم صدر نے اس سلسلے میں کوئی واضح اعلان نہیں کیا۔ تبھی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد نے اپنے کئے گئے اعلان کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حتمی فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا اور یہ فیصلہ صدر مملکت خود ہی کریں گے۔ اپوزیشن کی تمام جماعتیں بشمول اے آر ڈی اور ایم ایم اے اس تجویز پر سخت احتجاجی بیانات کے باوجود یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ کوئی بڑی تحریک چلانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور ایم ایم اے سے حکومت کے ساتھ معاہدے کے دوران ایک شق کی مکمل وضاحت نہ ہونے کے باعث چپ ہوگئی تھی اور اب آئینی ماہرین کی اکثریت صدر کو دونوں عہدے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ تاہم اس تمام بحث کا اہم ترین پہلو غالباً یہ ہے کہ صدر کے اس فیصلے کو مغرب بالعموم اور امریکہ بالخصوص کس طرح دیکھتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ ہمارے اہم محل وقوع اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے حلیف ہونے کی حیثیت سے ہم اس سے اپنے کئی فیصلے منوانے کا حق اور اس کے قابل ہیں تاہم خود امریکی صرف ایک نظریے کے حامی ہیں اور وہ یہ کہ ان کے ہاں فری لنچ کا تصور نہیں ہوتا۔ امریکہ اس وقت صرف تین بنیادوں پر پاکستان کے ساتھ اپنے مراسم میں دلچسپی رکھتا ہے جیسے وردی کے خلاف امریکہ کی جنگ ہمارا ایٹمی

پروگرام اور امریکہ کے معاشی حلیف بھارت کے ساتھ ہمارے مراسم ہیں۔ وائٹ ہاؤس کا اپنے مفادات کے لئے ایک قلیل المدت ایجنڈا ہوا کرتا ہے۔ اس کے تناظر میں اس وقت وہ پاکستان کو انتہائی اہم سمجھتا ہے۔ 28/05/1998 کو تب کے وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان نے انتہائی کامیابی سے پانچ ایٹمی دھماکے کر لئے ہیں اور اسی روز امریکن صدر بل کلنٹن نے امریکن کانگریس کو پاکستان کے اس اقدام سے مطلع کر دیا تھا حالانکہ وہ ایسا کرنے میں ایک ماہ کی تاخیر کر سکتے تھے۔ نتیجتاً 1954ء نیوکلیئر ایکٹ کے تحت پاکستان پر متعدد پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ فارن اسسٹنس ایکٹ کے تحت کی جانے والی تمام مالی امداد معطل کر دی گئی اور غیر ملکی فوجی امداد بھی روک دی گئی۔ قرضوں کے لئے دی گئی تمام امریکن گارنٹیز ختم ہو گئیں اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے علاوہ تمام دیگر امریکن بینک نے بھی اپنے قرضے روک دیئے۔ 12/10/1999 کی شب جب دنیا بھر کے میڈیا نے محمد نواز شریف کی برطرفی کی خبر نشر کی تو امریکن قانون کے فارن آپریشن بل کا سیکشن 508 حرکت میں آ گیا جس کے مطابق کسی بھی ایسے ملک سے براہ راست تعاون کی ممانعت ہے جہاں منتخب حکومت کسی بغاوت یا فوجی اقدام کے تحت معزول کر دی گئی ہو۔ چنانچہ صدر بل کلنٹن نے سیکشن 508 کے تحت پاکستان پر مزید پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کر دیا۔ امریکن قانون کے تحت یہ قانون سیکشن 508 صرف اسی صورت معطل ہو سکتا ہے جب صدر امریکہ کانگریس کو یہ بتائے کہ ایک جمہوری حکومت کا قیام اس ملک میں عمل میں لایا جا چکا ہے۔ مارچ 2000ء میں امریکی صدر بل کلنٹن پانچ روز تک بھارت کی سیر فرماتے رہے اور اس دوران انہوں نے وہاں دس ارب ڈالرز کی سرمایہ کاری کا بھی اعلان کیا۔ پھر وہ ساڑھے چھ گھنٹے کے لئے پاکستان تشریف لائے تاہم انہوں نے

یہاں دس ڈالر خرچ کرنا مناسب تصور نہیں کیا۔

وہ 31 سال میں پاکستان آنے والے اور پاکستانی عوام سے خطاب کرنے والے پہلے امریکی صدر تھے۔ 21 جنوری 2001ء کو جارج بش نے 45 ویں امریکی صدر کا عہدہ سنبھالا اور پھر 11 ستمبر 2001ء کو امریکی سرزمین پر دہشت گردی کے بعد جیسے سب کچھ بدل گیا۔ چند ہی دن بعد یعنی 22 ستمبر 2001ء کو امریکی صدر جارج بش نے صدارتی حکم نامہ 2001/28 جاری کیا جس کے الفاظ یہ تھے کہ ''پاکستان اور بھارت پر عائد کی گئی پابندیاں امریکی مفادات کے خلاف ہیں'' چنانچہ ہم پر سے ایٹمی دھماکوں کے سلسلے میں عائد کی گئی پابندیاں ہٹالی گئیں لیکن جمہوریت سے متعلق پابندیاں بدستور نافذ رہیں۔ چند ہی دن بعد یعنی 27/10/2001 کو صدر بش نے اعلان کیا کہ پاکستان پر جمہوریت کے سلسلے میں عائد پابندیوں کا خاتمہ وہاں بحالی جمہوریت میں مدد دے گا اور ایسا کرنا امریکہ کے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے لئے بھی سودمند ہوگا۔ چنانچہ صدر امریکہ کی طرف سے پاکستان کو سیکشن 508 سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا جس کے تحت کسی غیر منتخب حکومت کی امداد ممنوع قرار پاتی ہے۔ اکتوبر 2001ء میں دی گئی یہ دو سالہ مدت پچھلے سال یعنی 2003ء کے اکتوبر میں ختم ہو جانی تھی لیکن ایمرجنسی سپلیمنٹریل نمبر 106/PL108 کے تحت اس مدت کو اس ماہ یعنی ستمبر 2004ء تک بڑھا دیا گیا اور اسی دوران اکتوبر 2002ء میں ہمارے عام انتخابات کے نتیجے میں ایک پارلیمنٹ بھی وجود میں آ گئی لیکن پچھلے تین سالوں میں امریکی اندازِ حکمرانی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ 11 ستمبر 2001ء کے واقعات کے فوراً بعد وائٹ ہاؤس بڑی حد تک امریکن کانگریس کو ایک طرف دھکیل کے اہم ترین داخلی اور خارجی فیصلوں میں خودمختار ہو گیا تھا لیکن سالِ رواں کے وسط تک نقشہ تبدیل ہوتا نظر

آرہا تھا سینٹ کی مسلح افواج کی کمیٹی عراقی قیدیوں کے ساتھ انسانیت سوز مظالم پر رمز فیلڈ اور دوسرے جنرلز سمیت امریکی اسٹیبلشمنٹ کے کئی اکابرین کو اپنے کٹہرے میں لاکر سوالات اور الزامات کی چکی میں پیس رہی تھی جبکہ ایوان نمائندگان کی کمیٹی امریکی شخصیات کو اپنے سامنے طلب کر کے ان کی کارکردگی پر انہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس تمام عرصے کو اگر ہم امریکی امداد کا پیمانہ تصور کریں تو 2001ء میں یہ امریکی امداد کل 91 ملین ڈالر تھی جو 2002ء میں بڑھ کر ایک ہزار ایک سو 61 ملین ڈالرز تک پہنچ گئی تھی لیکن پھر 2003ء میں یہ 5 سو 22 ملین ڈالرز اور پھر اسی سال یہ تین سو 94 ملین ڈالر تک رہی۔ آج کا کوآپریٹ امریکہ پاکستان کے بھارت سے مراسم کو اہمیت دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھارت کو اپنا سبجیکٹ پارٹنر تصور کرتا ہے۔ تمام قسم کی ملٹی نیشنل کمپنیاں بھارت میں سرمایہ کاری کر رہی ہیں اس لئے بھارت کی GDP آج تین کھرب ڈالر کے لگ بھگ ہے اور اس امریکہ کی کوکھ سے جنم لیتے اور پھر بھارت کا نئی دہلی کی اسٹیبلشمنٹ سے مطالبہ ہے کہ امریکن سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے مشوروں سے کام کرا جائے اور ان حالات میں سرحدوں پر کشیدگی کم سے کم کی جائے یہ کوآپریٹ بھارت اس وقت کسی کے ساتھ جنگ نہیں چاہتا کیونکہ یہی کوآپریٹ امریکہ کی بھی اس وقت خواہش ہے نئی دہلی یہ سمجھتا ہے کہ فی الحال برصغیر میں جنگ امریکن سٹریٹیجک کے خلاف ہے۔ چنانچہ کوآپریٹ بھارت معاشی طور پر مضبوط ہو رہا ہے وہ اپنے دفاعی اخراجات کو بغیر اپنی معیشت پر بوجھ ڈالے بھی بڑھا رہا ہے۔ جیسا کہ ہم نے وہاں پچھلے چند برسوں میں اربوں ڈالرز کا دفاعی اخراجات میں اضافہ دیکھا ہے کوآپریٹ بھارت کی خواہش یہ ہے کہ ہم اس کی دفاعی اخراجات کے اضافے کے تناسب میں اپنے اخراجات میں اضافہ کرتے چلے جائیں اور ظاہر ہے کہ ہم اس وقت ایسا کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔ پھر

اتفاق سے 25 ستمبر کو یعنی چند روز بعد دولت مشترکہ کے وزارتی ایکشن گروپ کا اجلاس بھی متوقع ہے پچھلے اجلاس میں انہوں نے پاکستان کی دولت مشترکہ سے معطّلی کے فیصلے کا خاتمہ کرتے ہوئے اپنے پیراگراف 9 میں یہ لکھا تھا کہ دولت مشترکہ کا اجلاس توقع کرتا ہے کہ حکومت اور اپوزیشن جماعتوں کے درمیان دسمبر 2003ء میں ہونے والے معاہدے کا احترام ہوگا اور 17 ویں ترمیم مکمل طور پر کافی ہوگئی بشمول صدر اور آرمی چیف کے عہدوں کے علیحدگی کے ساتھ امریکہ اور مغرب کا صدر جنرل پرویز مشرف کے وردی کے سلسلے میں کیے جانے والے فیصلے پر کیا ردعمل ہوگا۔

18 ستمبر 2004ء

صدر جنرل پرویز مشرف کی وردی......

السلام علیکم!

امریکی دورے کے دوران مختلف مواقع پر کی گئی صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کی گفتگو کے باوجود یہ ابہام اب تک دور نہیں ہو سکا کہ صدر اپنی وردی سے متعلق کب اور کیا حتمی فیصلہ قوم کے سامنے سنانے جا رہے ہیں۔ دو صوبائی اسمبلیوں سے بھاری اکثریت کے ساتھ قراردادیں منظور ہو جانے کے بعد اچانک اس بارے میں آنے والے سیاسی بیانات میں کچھ کمی آئی ہے اور اس معاملے پر اس واضح مؤقف کے باوجود صدر کو دونوں عہدے اپنے پاس رکھنے میں کوئی آئینی رکاوٹ نہیں اور یہ کہ مخالف سیاسی جماعتیں بھی اس معاملے پر متحد نہیں اور خصوصاً اے آر ڈی اس معاملے پر متحدہ مجلس عمل کی طرف سے احتجاج سے خود کو علیحدہ رکھنا چاہتی ہے۔ بظاہر توقع تھی جس طرح سے اس نقطہ پر حکومتی وزراء زعماء کے بیانات اور پھر اسمبلیوں کا متحرک ہونا سامنے آیا تھا غالباً اسی طرح قومی اسمبلی کے رواں اجلاس میں ایکٹ آف پارلیمنٹ کے تحت اس اقدام کے حق میں ووٹنگ کروا کے معاملہ واضح کر دیا جاتا لیکن پھر جیسے کچھ ٹھہراؤ سا محسوس ہوا شاید اس کی وجہ صدر مملکت کا غیر ملکی دورہ ہے جس کے دوران

انہوں نے اس معاملے پر واضح اظہار خیال سے اجتناب کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ خود بھی وردی کے معاملے پر اس وقت کنفیوژن میں ہیں کہ اسے رکھیں یا چھوڑ دیں صدر مشرف کے دورے کے اختتامی مرحلے پر جب امریکن سیکرٹری خارجہ کولن پاؤل کا اخبار نویسوں سے سامنا ہوا تو وہاں بھی کشمیر، پاکستان کو جدید اسلحے کی فراہمی اور اقتصادی امداد کی بجائے وردی کا معاملہ سب سے پہلے اٹھ کر سامنے آیا جس پر کولن پاؤل کا کہنا تھا کہ ہم صدر مشرف سے بہت قریبی رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان سے مسلسل بات چیت ہوتی رہتی ہے، انہیں ہمارے خیالات کا بخوبی علم ہے کہ ہم پاکستان کو مکمل جمہوریت کی طرف لے جانے کے حق میں ہیں لیکن یہ وردی کا معاملہ خاصہ پیچیدہ ہے اور ہم اچھے ساتھی رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے صدر مشرف نے نیویارک ٹائمز کو اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر انہوں نے وردی اتاری تو دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف جنگ لڑنا دشوار ہو جائے گی دورہ امریکہ کے دوران مختلف ملاقاتوں اور گفتگو کے دوران مغربی ممالک کے انداز فکر کو مزید سمجھنا صدر کیلئے سہل ہو گیا ہو گا جیسا کہ صدر نے اس پروگرام میں کچھ عرصہ پہلے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مغرب کو ان کی وردی سے متعلق کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ دیکھنا ہے کہ صدر اپنے دورے سے فوری واپسی کے بعد اس بارے میں کیا اہم فیصلے کرتے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ صدر خود اپنی وردی کے سلسلے میں کب اور کیا اعلان کرتے ہیں چونکہ حتمی اعلان کیلئے وہ 31 دسمبر 2004ء تک انتظار میں ہیں، چند اہم فیصلے انہیں چند ہی اگلے روز میں کرنے ہیں کیونکہ چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی جنرل عزیز احمد اور وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد یوسف دو ہفتوں سے بھی کم عرصے میں 7 اکتوبر کو ریٹائرڈ ہو رہے ہیں اور صدر جنرل پرویز مشرف

کو اس سے پہلے ان دونوں عہدوں پر نئے افسران کا تقرر کرنا ہے۔ اپنی وردی کے بارے میں کئے جانے والے فیصلے سے قطع نظر ان دو فور سٹار جنرلز کے عہدوں پر صدر 25 لیفٹیننٹ جنرلز میں سے کسی کو بھی ترقی دے کر لا سکتے ہیں۔ تاہم لیفٹیننٹ جنرل جاوید حسن اور نیب کے چیئرمین لیفٹیننٹ جنرل منیر حفیظ 30 اکتوبر کو ریٹائر ہو جائیں گے۔ شمالی علاقہ جات کی فیڈرل آرٹلری کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے لیفٹیننٹ جاوید حسن کارگل آپریشن کے دوران فیلڈ کمانڈر رہے تھے۔ ستمبر 2001ء میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی سے پہلے وہ نیشنل ڈیفنس کالج کے کمانڈر تھے۔ اگر یہ دو لیفٹیننٹ جنرلز اپنے مقرر وقت پر ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں تو پھر سینئر ترین لیفٹیننٹ جنرل صدر کے چیف آف سٹاف لیفٹیننٹ جنرل حامد جاوید ہونگے۔ تاہم وہ 17 اپریل 2005ء کو ریٹائرڈ ہونے جا رہے ہیں۔ فہرست میں اگلا نمبر کراچی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل احسن سلیم حیات کا ہے وہ لیفٹیننٹ جنرل منیر حفیظ اور لیفٹیننٹ جاوید حسن سے ایک کورس جونیئر ہیں۔ اور پچھلے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عثمانی کے ماتحت جی سی او یعنی جنرل آفیسر کمانڈنگ کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل احسن سلیم حیات اسی سال 8 دسمبر کو ریٹائرڈ ہو رہے ہیں اور ان کی سنیارٹی فہرست میں موجود اگلے نام یعنی لیفٹیننٹ جنرل طارق وسیم غازی کے مساوی ہے جو اس وقت نیشنل ڈیفنس کالج کے کمانڈر ہیں۔ ایک پیش رو انفنٹری آفیسر کے طور پر شہرت رکھتے طارق وسیم غازی ماضی قریب میں کور کمانڈر کراچی کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ پھر اس فہرست میں طارق وسیم غازی اور احسن سلیم حیات سے چند ماہ جونیئر کور کمانڈر ملتان لیفٹیننٹ محمد اکرم' کور کمانڈر بہاولپور لیفٹیننٹ جنرل سیّد پرویز شاہد' آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل احسان

الحق اور ڈائریکٹر جنرل کمپیوٹرز جی ایچ کیو لیفٹیننٹ غلام مصطفیٰ کے نام ہیں۔ ان میں سے لیفٹیننٹ جنرل محمد اکرم مارچ 2001ء میں جی ایچ کیو میں بطور ملٹری سیکرٹری تبادلے سے پہلے آئی ایس آئی میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل پرویز شاہد جو کہ جنرل یوسف کے بعد اگلے وائس چیف آف سٹاف کے عہدے کیلئے ایک اہم نام تصور کئے جا رہے ہیں وہ فوج کا اعزاز یعنی سورڈ آف آنرز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل احسان الحق اس سے پہلے کور کمانڈر پشاور اور ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشن کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ جنرل احسان الحق اگلے سال 4 مئی کو ریٹائر ہونگے۔ تاہم ان کے فور سٹار جنرل کے طور پر چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے طور پر ترقی ممکن ہے اور اسی عہدے پر جنرل عزیز کی ریٹائرمنٹ کے بعد بحریہ کے چیف ایڈمرل شاہد کریم اللہ بھی فائز ہو سکتے ہیں۔ فہرست میں موجود اگلے پانچ لیفٹیننٹ جنرلز ایئر ڈیفنس انجینئرنگ کور لیگل، پلاننگ اور پرنٹ ڈویژن سے ہیں یہ تمام یعنی لیفٹیننٹ جنرل حسن خان، لیفٹیننٹ جنرل محمد زبیر، لیفٹیننٹ جنرل فیض جیلانی ڈائریکٹر جنرل اسٹیٹجک پلاننگ، لیفٹیننٹ جنرل خالد قدوائی انسپکٹر جنرل ٹریننگ لیفٹیننٹ جنرل ضرار عظیم اگلے سال اکتوبر تک ریٹائر ہو جائیں گے تاہم فہرست میں 15ویں نمبر پر جی ایچ کیو میں ملٹری سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے سابق کور کمانڈر راولپنڈی عارف حسن ہیں اور وہ فہرست میں موجود لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز سے چھ ماہ سینئر ہیں۔ جنرل صدیقی 31 دسمبر کو سنیارٹی لسٹ میں 12ویں نمبر پر ہونگے۔ اگلے سال ریٹائر ہونے والے آخری آفیسر اس فہرست میں موجودہ کور کمانڈر کوئٹہ لیفٹیننٹ جنرل شاہد حمید ہونگے جو کہ اس وقت

17ویں نمبر پر ہیں اور ان کے بعد کے آفیسرز 2006ء یا اس کے بعد ریٹائر ہونگے اور فی الحال وہ سینئر ترین عہدوں کیلئے زیر غور تصور نہیں ہو رہے۔ دو تین روز پہلے اس پروگرام میں افواج پاکستان کے سابق سربراہ مرزا اسلم بیگ کا ملکی عمومی سیاسی اور صحافتی حلقوں کے برخلاف یہ یقین تھا کہ صدر مشرف وردی چھوڑنے کا اعلان کر دیں گے اور ملک میں اگلے سال ایک عام الیکشن ہو سکتے ہیں جن سے پہلے حکومت اور پیپلز پارٹی کے درمیان مفاہمت ہو جائے گی۔ پیپلز پارٹی کی قائد محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان اطلاعات کو محض ڈس انفارمیشن قرار دیتے ہوئے واضح کہا کہ ان کی جماعت کسی صورت حکومت سے مفاہمت کیلئے چور دروازہ تلاش نہیں کرے گی۔

28 ستمبر 2004ء

کچھ اہم تقرریاں اور وردی

السلام علیکم!

پچھلے دو روز میں افواج پاکستان میں ہونے والی اہم ترین تقرریوں سے یہ مضبوط ترین عندیہ تو مل رہا ہے کہ صدر مملکت جنرل پرویز مشرف اپنے پاس دونوں عہدے رکھنے جا رہے ہیں تاہم اس بارے میں اعلان صدر کی طرف سے آنے سے پہلے کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ دو اہم ترین نئی تقرریوں میں سے ایک تو وائس چیف آف آرمی سٹاف کی ہے جہاں جنرل احسن سلیم حیات آئے ہیں جو 8 دسمبر کو ریٹائر ہونے جا رہے تھے اور سنیارٹی لسٹ میں سینئر ترین تھے۔ 1991ء میں جنرل آصف نواز کے بعد یہ دوسرا موقع ہے کہ کور کمانڈر کراچی کو فور اسٹار جنرل کے طور پر ترقی دی گئی ہے اور اس عہدے پر تقرری اس اہم ترین تناظر میں دیکھنی چاہیے کہ اگر صدر مملکت کسی موقع پر چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں اگرچہ اس کے امکانات نہیں ہیں تب وائس چیف ہی اس عہدے کو سنبھالیں گے۔ دوسری اہم ترین تقرری آئی ایس آئی کے نئے چیف کے طور پر کور کمانڈر راولپنڈی کے فرائض سرانجام دیتے لیفٹیننٹ جنرل اشفاق پرویز کیانی کی ہے جنہوں نے فور اسٹار جنرل پر تقرری پانے والے جنرل احسان الحق کی جگہ لی ہے۔ جنرل احسان الحق

دوسرے ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی ہیں جو چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں۔ ان سے پہلے 1987ء میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کا ایک طویل عرصے تک آئی ایس آئی کے سربراہی کے بعد صدر ضیاء نے اس عہدے پر تقرر کیا تھا۔

یہ عہدہ سیری موئیل کہلائے جانے کے باوجود افواج پاکستان میں ایک اہم منصب اور نیشنل سیکورٹی کونسل کے رکن کے طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ افواج میں ان اہم ترین تبدیلیوں اور تقرریوں کے ساتھ جہاں ایک طرف وردی کا سوال حل ہوتا نظر آتا ہے وہاں دوسری طرف اپوزیشن جماعتیں اور خصوصاً متحدہ مجلس عمل کا اس معاملے پر مؤقف کچھ دھندلاتا جا رہا ہے۔ اکتوبر کے آغاز میں منظر نامہ واضح ہو جانے کے باوجود متحدہ مجلس عمل کسی بھی قسم کی احتجاجی تحریک کو 31 دسمبر یا پھر رمضان کے بعد تک مؤخر کرنے سے بضد ہیں اور ہمارے پس چلمن حلقے مہینوں بعد تحریک کیلئے آنے والے ان اعلانات کے پس منظر سے واقف ہونے کے باعث انتہائی اطمینان سے صورتحال کا جائزہ لے رہے ہیں۔

تین سال پہلے افغانستان اور پھر عراق کے خلاف ہونے والی امریکی فوجی کارروائیوں کے بعد دنیا بھر کے پرامن عوام میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص جو اضطراب اور بے چینی اور غم و غصہ پیدا ہوا وہ 2002ء کے عام انتخابات میں دینی جماعتوں پر بھرپور عوامی اعتماد کے طور پر سامنے آیا۔ پاکستان کی 57 سالہ سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ مذہبی جماعتیں بھاری اکثریت کے ساتھ نہ صرف قومی اسمبلی تک پہنچیں بلکہ ایک صوبے میں مکمل اور دوسرے میں اشتراک کے ساتھ حکومت سازی میں بھی کامیاب ہوئیں۔ ایل ایف او پر دونوں اپوزیشن اتحاد یعنی اے آر ڈی اور ایم ایم اے

پارلیمنٹ کی کارروائی میں رخنہ ڈالنے میں کامیاب رہے لیکن پھر حکومت سے 17 ویں آئینی ترمیم پر معاہدے اور قائد حزب اختلاف کا عہدہ مولانا فضل الرحمٰن کو ملنے کے بعد دونوں کے رستے نہ صرف جدا ہو گئے بلکہ ایک دوسرے پر الزامات کا سلسلہ بھی شروع ہوا' ایک ایسا سلسلہ جو وردی کے معاملے پر اعلان کی جانے والے متحدہ مجلس عمل کی تحریک سے اے آر ڈی کی لاتعلقی کے اعلان کی صورت میں سامنے آیا۔ اے آر ڈی کا تحریک سے خود کو الگ رکھنے کا فیصلہ سیاسی حلقوں میں مختلف انداز میں دیکھا جا رہا ہے۔ اے آر ڈی ایک غیر انتخابی اتحاد ہے کیونکہ اس کی دونوں بڑی حریف جماعتوں کے امیدواروں نے 2002ء میں ایک دوسرے کے مدمقابل الیکشن لڑا تھا۔ دونوں جماعتوں کے قائدین اس وقت ملک سے باہر ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ مستقبل میں اگر سیاسی خاکہ کبھی تبدیل ہوا تو ایک بار پھر وہ ایک دوسرے کے حریف ہونگے۔ چنانچہ دونوں جماعتیں اتحاد میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ اس وقت اسلام آباد میں ایک بار پھر حکومت اور پیپلز پارٹی کے درمیان مفاہمت کی خبریں گردش کر رہی ہیں۔ اور اس بار یہ کہا جا رہا ہے کہ اس معاملے میں محترمہ کی جانب سے وردی کی حمایت کے جواب میں ان کی وطن واپسی آصف علی زرداری کی رہائی اور چیئرمین سینٹ کا عہدہ اور سندھ حکومت پیپلز پارٹی کو دینے کی بات چیت آگے بڑھ سکتی ہے۔ پیپلز پارٹی اور حکومت کے حلقے ایسے کسی بھی معاہدے کے امکانات کو رد کر رہے ہیں اور پیپلز پارٹی کے حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر ایسا کرنا ہوتا تو زرداری سات سال سے زیادہ عرصہ جیل میں کیوں گزارتے۔ کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ محترمہ کی طرف کسی حکومتی نمائندہ کا جانا دراصل متحدہ مجلس عمل کیلئے پیغام ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے حد سے زیادہ بڑھنے کی کوشش کی تو انہیں ڈمپ کر کے پیپلز پارٹی سے اتحاد کر لیا جائے گا جو کہ بیشتر خارجہ اور

داخلہ پالیسیوں کے حوالے سے اس وقت حکومت کی فطری اتحادی ہوسکتی ہے۔ اے آر ڈی کی دوسری اتحادی جماعت یعنی مسلم لیگ نواز کے صدر میاں شہباز شریف کے اہل خانہ اس وقت ان کی صاحبزادیوں کی شادیوں کے سلسلے میں وطن میں حکومت کی اجازت کے تحت موجود ہیں۔ اور جدہ میں قاضی حسین احمد کا میاں صاحب سے تحریک کیلئے حمایت حاصل نہ کر پانا مسلم لیگ نواز کی کسی مفاہمت کی نہیں تو فی الحال وردی کے معاملے پر کچھ سیز فائر کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔ اب واپس متحدہ مجلس عمل کی جانب سے 31 دسمبر یا عیدالفطر کے بعد وردی کے خلاف چلائی گئی تحریک کی طرف آتے ہیں۔ متحدہ مجلس عمل میں شامل 6 مذہبی جماعتوں میں سے ایک یعنی مولانا سمیع الحق کی جمعیت علمائے اسلام بڑی حد تک اپنے رستے قاضی اور مولانا فضل الرحمٰن صاحبان سے جدا کر چکی ہے جہاں جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کے حوالے سے دباؤ میں آتی ہے وہاں جماعت اسلامی کی قیادت اس اتحاد کا شیرازہ بکھرنے اور پھر القاعدہ کے ساتھ اپنے روابط کے حوالے سے مختلف وقتوں میں لگائے گئے الزامات کے دباؤ کا شکار ہوتی رہی ہے وہ محاذ آرائی کی کسی ایسے رستے پر پہنچنا نہیں چاہتے جہاں وہ سب کچھ کھو بیٹھیں اور حاصل کچھ بھی نہ ہو خصوصاً تب جب امریکہ دو صوبوں میں ان کی حکومت کو مستقبل میں جاری دیکھنے کا مزید خواہش مند نہیں ہے۔

اپوزیشن جماعتوں کے اس اضطراب کے دوران دلچسپ لیکن کچھ پراسرار سا معاملہ اچانک پارلیمنٹ میں موجود حکمران سیاسی جماعتوں کا بھی نظر آتا ہے جو کچھ خاموش ہیں۔ نئی کابینہ کے کئی اراکین اب تک ایک ماہ گزر جانے کے باوجود اپنے محکموں کے حوالے سے عوام کے سامنے رونمائی نہیں کر پائے۔ مسلم لیگ کو منظم کرنے کی کوششیں جو کہ انتہائی برق رفتاری سے شروع ہوئی تھیں وہ کچھ سرد نظر آرہی ہیں۔ مسلم لیگی قیادت کو

آخری مرتبہ تب انتہائی متحرک انداز میں دیکھا تھا جب نئی کابینہ وجود میں آئی تھی۔ عوامی اجتماعات، تنظیمی اجلاس، دورے ایک دوسرے کو مبارکبادیں۔ حالیہ پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں حکمران اراکین کا سرد مہری سے حصہ لینا اور پھر کورم کا بار بار ٹوٹنا میرے اس اندیشے کو تقویت پہنچا رہا ہے کہ اپوزیشن کی صفوں میں گہری ہوتی دراڑوں کے ساتھ ساتھ خود حکومتی حلقوں میں بھی معاملات درست نہیں۔ ایک بڑی کابینہ کی تشکیل اور بہت سے اراکین کو کچھ نہ کچھ مل جانے کے باوجود دوسرے کو زیادہ مل جانے کا دکھ بہت سے چہروں پر پڑھا جاسکتا ہے۔ حکمران سیاسی اتحاد کی اکثریت کو یقین ہے کہ پیپلز پارٹی یا مسلم لیگ نواز سے کسی بھی قسم کی مفاہمت موجودہ سیاسی حالات میں ناممکن ہے کیونکہ صدر مملکت دونوں جلاوطن رہنماؤں یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو کسی صورت ملکی سیاست میں واپسی کا رستہ دینے پر آمادہ نہیں ہونگے۔ تاہم یہ سرکاری اراکین اس امر پر ضرور متفق ہیں کہ موجودہ سیاسی سیٹ اَپ کا مستقبل ضرور مشکوک نظر آرہا ہے۔ غالباً اسی خاموشی کے خاتمہ کیلئے 8 اکتوبر کو ایک بار پھر قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس میں کورم کا مسئلہ یوں نہیں اٹھے گا کیونکہ صدر مملکت خود اجلاس کے دوران ملک میں موجود ہونگے۔

5 اکتوبر 2004ء